



# گھر سے گھرتک

حاجی مقتدر احمد کے دیوان خانے میں قدم رکھتے ہی شیخ نور الزمان کی بیوی عشرت خانم ان کی بیٹی ہما اور بیٹے وقار کا سارا رعب داب صابن کی جھاگ کی طرح فشا فش غائب ہو گیا۔ یہ لوگ جس کا رہ میں حاجی صاحب کے ہاں آئے تھے وہ اتنی لمبی تھی کہ اگر ہوا تی اڑے پر کھلے دروازوں سے کھڑی ہوتی تو لوگ اسے طیارہ سمجھ بیٹھتے۔ حاجی صاحب کی ٹکلی میں مرتے ہوئے ڈرائیور کو اسی لیے خاصی وقت ہوئی تھی۔ پھر یہ کار جتنی لمبی تھی اتنی اسی خوبصورت اور چمکیلی بھی تھی۔ اسے دیکھ کر عام آدمی کا ایکا ایکی بھی چاہتا تھا کہ اسی چھوٹا اور محسوس کرنا چاہیے مگر فوراً خیال آتا تھا کہ اس بھائیکی کا رچھونا یقیناً خلاف قانون ہو گا اور پولیس پکڑ کر لے جائے گی۔

کار حاجی مقتدر احمد کے مکان کے سامنے رکی تو باور دی ڈرائیور نے اتر کر کار کے باقی تینوں دروازے کھولے۔ عشرت خانم ہما اور وقار پھول میں سے بھروسوں کی طرح برآمد ہوئے۔ پھر ڈرائیور نے ایک شان بے نیازی کے ساتھ تینوں دروازے تراخ پڑا خند کیے تو ٹکلی کے اس سرے سے اس سرے تک کھڑکیوں میں سے جھانکتی ہوئی عورتوں اور آدمی آدمی لفکتی ہوئی لڑکوں کے لکھجے دھک سے رہ گئے۔ ڈرائیور بائیکس بازو کو ہوا میں لہرا کر کلائی کو آنکھوں کے قریب لایا اور گھڑی میں وقت دیکھا۔ پھر اپنی سیٹ بیٹھ کر موٹھیں مرورد نے لگا۔

حاجی مقتدر احمد کی بیوی نور النساء نے دروازے پر عشرت خانم ہما اور وقار کا استقبال کیا اور کار کی طرف یوں دیکھا جیسے بچے پیشہ کی طرف دیکھتے ہیں۔ پھر جب تینوں مہمان حاجی صاحب کے دیوان خانے کا ریشمی پر دہ ہٹا کر اندر داخل ہوئے تو پائدان پر ڈرادر کو یوں کھڑے رہ گئے جیسے آگے قدم بڑھایا تو بے ادبی کا رہا کاب کر بیٹھیں گے۔

سب سے آگے عشرت خانم تھیں۔ انہوں نے قائم پر قدم رکھا تو ڈگنگیں جیسے پھسلنے سے بھی ہیں۔ پلت کر انہوں نے ہما کی طرف دیکھا اور شلوار کے پانچوں کو ذرا اٹھا کر صوفے کی طرف بڑھیں جیسے تالاب میں اترنے چلی ہیں۔ ہما اور وقار پر بھی کم و بیش یہی عالم گزر گیا۔ نور النساء نے سلیپر پائداں پر اتار دیئے اور ایک ڈگ بھر کر تخت کے پاس کھڑی ہو گئیں۔ سب اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھنے لگے تو وقار ایک دم پیچھے ہٹ کر دروازے کے پاس پلٹش میں لپٹنے ہوئے ایک موندھے پر دربان کی طرح بیٹھ گیا۔

نور النساء چونک کر بولیں ”اے ہے وقار میاں یہ کیا کر رہے ہو؟ ..... اے بہن عشرت خانم اسے سمجھا جائے۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ وہیں موندھھے پر ہی نک گیا۔ اٹھو بیٹا اٹھو صوفے کس لئے رکھے ہیں؟“

عشرت خانم نے وقار سے کہا۔ ”من رہے ہو میاں تمہاری خالہ جان کیا کہہ رہی ہیں؟“

وقار کچھ اس طرح چل کر صوف کی طرف گیا جیسے ایک ایک سیرھی چھوڑ کر زینداتی ہے۔ اسے کے بعد تکلفات شروع ہوئے۔ تہذیب برتنی جانے لگی۔ موسم کی بواحیوں کا ذکر چلا۔ پھر نور النساء الحسیں ”ہائے میں نے مخصوصہ کو تو بتایا ہی نہیں کہ تمہاری خالہ جان آتی ہیں۔“

وقار جو دا بھیں ناٹنگ کو با بھیں ناٹنگ پر رکھ کر اور ہماں کی طرف دیکھتے ہوئے یوں سکرا جیسے کہ رہا ہے ”دیکھتے باجی، انہیں منع کر لیجئے۔“

ہماکھڑ کھراتے ہوئے ریشم کے لباس کو سنبھالتی ہوئی انھی اور مسکرا کر بولی ”آپ تشریف رکھیے خالہ جان! مخصوصہ کو میں لیے آتی ہوں۔“

نور النساء فورا بولیں ”نہیں نہیں ہما بھی! تم بیخو۔ میں تو کروں سے چائے لگانے کو بھی تو کہہ دوں۔“

نور النساء سلیپر پچھاتی سیرھیوں پر چڑھنے لگیں تو ہما بولی ”دیکھا ماں! میں نہ کہتی تھی؟“

”ای لیے تو میں آتی نہیں تھی۔“ عشت خانم بولیں ”سبھی میں نہیں آتا، حاجی صاحب نے اتنی بہت سی دولت کہاں سے بثور کھی ہے؟“

”غایبچہ دیکھنے جیسے سندر کا جھاگ ہے۔“ ہمانے ہاتھ بڑھا کر غایبچے میں الگیوں کی پوریں ڈیوڈیں ”پاؤں رکھو تو تھاہ نہ پاؤ۔ ایک ہزار روپے کا تو ہو گا۔“

”ایک ہزار کا؟“ وقار پہلی بار بولا ”کمال کرتی ہیں باجی! دس ہزار کہنے۔“

”آہستہ بولو۔“ ہمانے آہستہ سے کہا ”جب لڑکیوں کو دیکھنے آتے ہیں تو آہستہ آہستہ بولتے ہیں۔ یوں سمجھو کہ ہر پردے کے پیچھے کوئی کھڑا تمہاری باتیں سن رہا ہے۔“

”دس ہزار کا اگر صرف یہ غایبچہ ہے تو اس دیوان خانے کا پورا سامان ایک لاکھ سے کم کا کیا ہو گا۔“ عشت خانم نے صوفے میں گھوم کر پورے دیوان خانے پر نظریں دوڑا بھیں۔ ”ایک لاکھ کوئی معمولی رقم نہیں ہے۔ منہ میں ساتی ہے، جب میں رکھو تو پھٹ کر نیچے جا پڑے۔“

ہما جو دروازے کے قریب والے صوفے پر بیٹھی تھی، چمکتے ہوئے پردے کو چھو کر کہنے لگی ”خاص ریشم کے تو پردے ہیں۔“ پھر وہ پردے کو ذرا سا جھٹک کر بولی ”یہ دیکھنے ذرا سی لشکن جو پیدا ہوتی ہے وہ پانی کی اہر کی طرح آخر تک چلی جاتی ہے۔ یہ دیکھنے یہ دیکھنے، ہمانے پردے کو دو تین بار جھٹکا۔

”اے رہنے دے۔“ عشت خانم نے سرزنش کی۔ کیا کر رہی ہے پردہ گر پڑے گا۔ ”پھر دا بھیں ہاتھ کی انگشت شہادت سے پردے گئتی ہوئی بولیں۔ ”ایک دو تین چار پانچ اور چھ۔ اکٹھے چھ پردے ہیں ایک جیسے۔“

”کچھ نہیں تو چھ سو کے تو سبھی ہوں گے۔“ ہما بولی۔

”لیجئے اور سنئے۔“ وقار ترپ اٹھا ”باجی تو کمال کر رہی ہیں۔ دو ہزار سے کم کے نہیں ہوں گے۔ لکھوا لیجئے مجھ سے۔“

”صوفہ دیکھئے بالکل نے فیشن کا ہے۔“ ہمانے تبصرہ جاری رکھا۔ ”تپائیوں پر رکھے ہوئے عجائب دیکھئے۔ وقار امنل پیس پر وہ جو ہرن رکھا ہے وہ مٹی کا ہے کہ لکڑی کا؟“

وقار نے ہرن کی طرف جو ہری کی طرح دیکھتے ہوئے کہا ”نہ مٹی کا ہے نہ لکڑی کا۔ مجھے تو کسی حقیقتی پتھر کا معلوم ہوتا ہے۔ شاید حقین کا ہے۔“ ”حقین کا؟“ عشرت خانم ہرن کو دیکھنے کے لیے آدمی اٹھ گئیں۔

”بڑے بڑے گھروں کے دیوان خانے دیکھے ہیں۔“ ہمانے جھوم کر کہا۔ ”ایسے خانوں کہیں نظر نہیں آئے۔“ عشرت خانم ہاتھ مل کر بولیں ”انتنے بڑے گھر کی لڑکی جانے مزاج کی کیسی ہو گی؟“ ”میں نے کہا تھا کہ پہلے دیکھ دا کھ لیجھے۔“ وقار نے کہا۔

”ہا سے پوچھو۔“ عشرت خانم بولیں ”مجھے تو یہی گھیٹنے پھر رہی ہے۔“

”تو کیا ہے اماں؟“ ہابولی ”اس میں نقصان کون سا ہے۔ اتنا بہت سا جیزیر ملے گا۔“

”تم بھی تو اتنے بڑے گھر کی بہو بن کر گئی تھیں،“ عشرت خانم اوس ہو گئیں ” بتاؤ کیا ملا؟“ ”چپ۔“ ہمانے ہونوں پر انگلی رکھلی۔

تینوں یوں سنبھل بیٹھے جیسے ان کی تصویر اترنے والی ہے۔ سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ آرہی تھی۔ ساتھ ہی بغل والے کمرے میں ریشم پر دے کے اوہ چھینی کے برتن بجھنے لگے تھے۔

نور النساء پر وہ ہٹا کر بولیں ”آ جائیں۔ شرمانے کی کون ہی بات ہے۔

اپنی خالہ ہیں اپنی باجی ہماں جن سے تو سیمہ کے ہاں ملی تھی۔ سب اپنے ہیں آ جا۔“

محصومہ کی صورت میں ریشم اور نائکون کا ایک ڈھیر دیوان خانے میں داخل ہوا۔ وقار ادب سے کھڑا ہو گیا۔ عشرت خانم اور ہمانے محصومہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور نور النساء نے محصومہ کو وقار کے بالکل سامنے والے صوفہ پر بٹھا دیا۔

محصومہ نے ایک دوبار سر سے لکھتے ہوئے دو پیچے کو درست کرنے کے لیے اپنا ہاتھ یوں ہولے سے اٹھایا جیسے ذرا تیزی سی اٹھایا تو ریشم کہیں نہ کہیں سے ضرور مسک جائے گا۔ وہ عمر کے اس حصے میں تھی جہاں بد صورتی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ہما مخصوصہ سے باتیں کرنے کی کوشش کرتی رہی مگر ”جی“ یا ”بھی نہیں“ سے زیادہ اسے کسی سوال کا جواب نہ ملا۔ وقار ”محصومہ کو یوں چوری چوری دیکھتا رہا جیسے اپنے مکان کی چھت پر کھڑا ہے۔ نور النساء مخصوصہ کی سلیقہ مند یوں اور کشیدہ کار یوں کے قصے سناتی رہیں اور عشرت خانم ”ما شاء اللہ ما شاء اللہ“ سے جواب دیتی رہی۔

پھر جب لمحے کی صاف ستری شلوار قمیض میں ملبوس ملازم نے بغل والے کمرے کا دروازہ کھول کر پردہ سرکا یا اور سب لوگ طعام گاہ میں داخل ہوئے تو عشرت خانم تو جیسے گوگی ہو کر رہ گئیں۔ اتنی بڑی میز پر بچھے ہوئے متفش پلاسٹک پر انہیں ایسی کراکری نظر آئی، جس کے بارے میں انہوں نے بازار سے گزرتے ہوئے کئی بار کہا تھا کہ ایسے برخوبی کے لئے دو ہی جگہیں مناسب ہیں، دکانوں کے شوکیس یا وزیر وزراء کی طعام گاہیں۔ مگر یہ تو حاجی مقتدا احمد کا گھر تھا جس کے بارے میں ہمانے انہیں بتایا تھا کہ غیاری کی دکان ہے اور خاصے کھاتے پیتے آدمی ہیں۔ ”یہ تو خاصے کھاتے کھلاتے پیتے چھالکاتے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔“ عشرت خانم نے سوچا۔ طعام گاہ کے بڑے پن کو صرف ایک رینفریج بڑی کمی نے تھیس پہنچا رکھی تھی یا مخصوصہ کی انتہا درجے کی شرم و حیان۔ مخصوصہ نے تو بڑے گھروں کی لڑکیوں کی طرح چہک چہک کر چائے بنائی، نہ کوئی پلیٹ اٹھا کا وقار تو چھوڑ ہما اور عشرت خانم تک سے کہا کہ یہ خاص میرے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیز ہے۔ نہ اس نے کسی ذرا سی بات پر بڑا ساقہ بھہ لگایا اور نہ اس انداز سے تعجب کا اظہار کیا کہ سب لوگوں کی ہنگامیں اس پر گزر جاتیں اور اس کی بھوؤں کے کشیلے پن اور آنکھوں کے ہوش رہا طول و عرض سے لے کر اس کی بھی گردن کے مرمر تک کا جائزہ لے آتیں۔ وہ ہما اور اپنی اماں کے درمیان بیٹھی دیر تک مسلسل ایک ہی بسکٹ کو ڈر اڑ رہا چکھتی رہی اور پیالی میں سے ایک ایک قطرہ چائے پی کر اسے یوں کوئی آواز پیدا کیے بغیر رکھتی رہی جیسے پیالی اور پرچ دنوں گتے سے بنی ہیں۔

” حاجی صاحب جب عدن میں بنس کرتے تھے۔“ نور النساء نے بتایا ”تو دنیا جہان کے عجائب اپنے گھر میں بھرتے رہے۔ چھ قدم کے تو چائے کے صرف روی سیٹ تھے۔ کافی کے تین سیٹ انہوں نے ولایت جانے والے ایک دوست کے ہاتھ جرمن کے ملک سے منگائے اور ان کی قیمت جوادا کی اس کا اندازہ آپ سے زیادہ کس کو ہو گا۔ ایران سے وہ جس آدمی کے ہاں سے قالمین منگاتے تھے وہ ان سے یوں خط و کتابت کرتا تھا جیسے حاجی صاحب عدن میں قالمینوں کے سوداگر ہیں۔ میں ایک بار انہیں کھانے کے کمرے کی میزیں خریدنے کا شوق چرا یا تو ایک دو سال کے اندر سا گوان کی اکٹھی پانچ میزیں جمع کر لیں۔ میں چیختی چلتی تو بجائے اس کے کہ نیلام کر دیتے، اپنے انگریز دوستوں کو مفت میں دے آئے۔ نیلام کرتے تو چار پانچ ہزار روپے تو ضرور آ جاتے۔ اب آپ سے زیادہ کس کو اندازہ ہو گا کہ اگر نیلام کے دام یہ ہیں تو اصل قیمت کیا ہو گی۔ پھر جب اتنے بڑے بچھے میں ایک تنکا تک رکھنے کی جگہ نہ رہی اور ادھر اپنے وطن کی آزادی کے بعد انہوں نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا تو ساری عمر کی کمائی وہیں اونے پونے بیچنا پڑی۔ بڑے بڑے انگریز افسروں اور عرب شیخوں نے آکر بولیاں دیں۔ گھر سے باہر بازار لگ گیا۔ مخصوصہ اس وقت بھی کوئی چار پانچ سال کی ہو گی۔ اسے بھی یاد ہو گا کہ اس روز کیسے سارا عدن ہمارے گھر سے باہر الم پڑا تھا۔ یاد ہے نہیں؟“

”جی،“ مخصوصہ بولی۔

"اور بہن عشرت خامم۔" نور النساء نے کہنا شروع کیا۔ "واپس وطن آکر....."

باہر کا دروازہ کھلا اور صاف سترے طازم نے اندر آ کر پوچھا:

"اور چائے لادول بی بی؟"

"لے آؤ" نور النساء فوراً بولیں۔

عشرت خامم اور ہما چلاٹھیں "نہیں نہیں۔ ابھی رکھی ہے"

کچھ دیر خاموشی رہی اور طازم ادب سے دہیں کھڑا رہا۔

سلسلہ کلام جاری رکھنے کے لیے نور النساء نے گلا صاف کیا اور عشرت خامم کی طرف متوجہ ہو گئیں مگر فوراً سیدھی ہو گئیں اور بولیں

"ضرورت ہوئی تو بولیں گے جاؤ"۔

طازم چلا گیا تو نور النساء بولیں "تو بہن! وہ میں کہہ رہی تھی کہ وطن واپس آ کر حاجی صاحب نے کتابیں جمع کرنے کا سلسلہ شروع کیا تو اب تک ختم ہونے میں نہیں آیا۔ ادھر جس کمرے میں بھی جائے کتابیں ہی کتابیں ٹھنسی پڑی ہیں۔ مخصوصہ اور میں کسی اور بات کی عادی تھیں۔ سو یہ سب غریبانہ چیزیں جو آپ کو یہاں نظر آ رہی ہیں وہ ہم دونوں ہی کی دوڑ بھاگ کا نتیجہ ہیں۔ چیزیں میں نے جمع کر دی ہیں، انہیں ترتیب سی لگانے کا سلیقہ مخصوصہ کا ہے۔"

"ماشاء اللہ ماشاء اللہ" عشرت خامم بولیں۔

"سلیقہ ہی توبہ کچھ ہے۔" ہما بولی "ورنہ میں تو آدمی سے بھی زیادہ تیزی سے کام کر سکتی ہے۔"

وقارا پنے مکان کی چھت پر کھڑا نظر آنے لگا۔

واپس دیوان خانے میں آ کر سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے مگر مخصوصہ کھڑی رہی اور اسے کھڑا دیکھ کر وقار بھی ہڑ بڑا کر انہوں کھڑا ہوا۔ پھر نور النساء نے کہا "اوھ آج میری بیٹی جیلہ کے بچے آئے ہوئے ہیں۔ صحیح سے دھماچو کڑی مچار کھی ہے۔ مخصوصہ کو اجازت دیجئے کہ جا کر انہیں سنجا لے۔ چائے پینے میں کپڑے سان دیں گے۔ چھوٹے چھوٹے سے ہیں۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" عشرت خامم بولیں۔

"میں بس ایک منٹ میں حاضر ہوں۔" نور النساء نے کہا اور بیٹی کے ساتھ باہر چلی گئیں۔ چند منٹ تک ماں بیٹی اور بیٹا چپ چاپ

بیٹھ رہے جیسے مینار کی سیڑھیاں طے کرنے کے بعد چوٹی پر آئے ہیں تو چکر اگئے ہیں۔

"اماں جی!" ہما بولی "ویکھا؟"

عشرت خامنہ بھی جواب نہیں دے پائی تھی کہ باہر سے ڈرائیور کی آواز آئی۔ ”لبی بی جی!“ ”کیا بات ہے؟“ عشرت خامنہ جلدی سے باہر نکلیں۔ ڈرائیور کی بات سن کر بولیں ”بس کوئی پانچ منٹ میں زیادہ نہیں۔“ ڈرائیور اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔

عشرت خامنہ نے اوپر جاتی ہوئی سیریز ہیاں کی طرف دیکھا۔ ڈرائیور کھڑے سوچتی رہیں، پھر دیوان خانے کے دروازے کا پردہ ہٹا کر بولیں ”تم دونوں نہیں بن ٹھو۔ میں ایک منٹ میں اوپر سے ہو کر آتی ہوں۔ نور النساء کے نواسوں کو ایک ایک روپیہ دے آؤں۔“

”ایک ایک روپیہ؟“ ہما بولی ”نہیں اماں دو دو دیجئے گا۔ کیوں وقار؟“

”اماں کی مرخصی ہے۔“ وقار بولا۔

”دور دو دے دوں گی پر نہ جانے ہیں کتنے؟“ عشرت خامنہ سوچنے لگیں۔

ہمانے بڑی ناگواری سے کہا ”افوہ اماں! کبھی کبھی تو آپ حد کر دیتی ہیں۔ جتنے بھی ہوں پر دیجئے گا دو دو؟“

عشرت خامنہ نے کچھ کہے بغیر پردہ گرا دیا اور آہستہ آہستہ اوپر جانے لگیں۔ سیریز ہیوں کے پہلے ہی موڑ پر رک گئیں کیونکہ اوپر سے نور النساء اتر رہی تھیں۔ انہوں نے عشرت خامنہ کو یہاں کھڑے دیکھا تو پہلے تو ہر کا بکارہ گئیں۔ پھر بولیں ”اے بہن! دیوان خانے میں جا کر بیٹھئے۔ یہاں کھڑی کیا کر رہی ہیں؟“

”یونہی ڈرائی کہ اوپر سے بھی ہواؤں۔“ عشرت خامنہ نے مسکرا کر کہا۔ ”دو تین منزلوں والے مکان میں گھر کا ماحول اوپر کے حصے میں

ہی ملتا ہے اور میں گھر بیوی عورت ہوں۔ پھر آپ کے نواسے نواسیوں کو بھی تو نہیں دیکھا۔ چلنے۔ ملا دیجئے ان سے۔“

”میں انہیں نیچے ہی بلاۓ لیتی ہوں۔“ ”نور النساء بعذر رہیں۔“ ایک تو اوپر پہلو نے دنیا جہاں کا کوڑا کر کھا ہے۔ دوسرا ہے.....“

”تو کیا ہوا؟“ عشرت خامنہ نے اگلی سیریز پر قدم رکھ دیا اور نور النساء نے کوبازو سے پکڑ کر کہا ”آئیے۔“

”نیچے ہما بیٹھی اور وقار بیٹا کیا کہیں کہ۔۔۔“ نور النساء نے احتجاج کیا۔

”کچھ نہیں کہیں گے۔“ عشرت خامنہ نے نور النساء کو ہمیختا۔ میں ان سے کہہ آئی ہوں کہ میں اوپر جا رہی ہوں۔“

نور النساء چپ چاپ عشرت خامنہ کے ساتھ ہو لیں۔

آخری سیریز تک پہنچی تھیں کہ معصومہ کی ہمکنی ہوئی آواز آئی۔

”اے لکشم! اس زاہد کے بچے کو پکڑ۔ یہ چائے سے نہ ہوئے ہاتھ لیے میرے کپڑوں کی طرف بڑھ رہا ہے۔ میں نے تو اتنی دیر تک نیچے بیٹھ کر ان کی استری تک خراب نہیں ہونے دی اور یہاں سے مدھونے چلا ہے۔ سلیمان کیا کہے گی کہ.....“

یک نور النساء نے اوپنجی آواز میں باتمیں کرنا شروع کر دیں۔

"میری تو بھجھے میں نہیں آتا بہن! کہ آپ کوکس کمرے میں لے جاؤ۔ آج تو یہاں سے وہاں تک پچوں کا گھر بننا ہوا ہے۔ وہ اٹھا جنچ مچائی ہے انہوں نے کہ اللہ میری توبہ ہے۔ پھر جس طرح انہوں نے یہاں کیا یک بولنا شروع کیا تھا اسی طرح یہاں کیا یک رک گئیں اور چھرے پر اسی کیفیت طاری کر لی جیسے کان لگا کر بھجھن رہی ہیں۔

عشرت خامن نے اپنی میز بان کو ایک لمحہ غور سے دیکھا۔ پھر بولیں۔ "ادھر پچوں کے پاس چلتے ہیں۔"

"ہائے بہن وہاں تو۔۔۔" نور النساء جیسے روئے کے قریب پہنچ گئیں مگر عشرت خامن کو بڑھتا دیکھا تو ان کے ساتھ ہو لیں۔

"اے ہے بیٹی، کپڑے بدل لئے؟ عشرت خامن دروازے کے سامنے جا کر بولیں اور نور النساء نے قدم روک لئے جیسے اپنی بیٹی سے ان کا پردہ ہے۔

میلی داغی دیواروں اور جالوں بھری چھت والے اس کمرے کے دروازے پر پرانے دوپے کا ایک ادھورا سا پردہ لٹک رہا تھا جس کا ایک سراخا کر کوڑا سے انکا دیا گیا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں نوٹی ہوئی ادوائیں کا ایک کھنلا پڑا تھا جس پر معصومہ کے ریشمی لباس کا ڈھیر رکھا تھا اور پانچتی کے پاس پانچ چھپے بر س کا نگاہ زاہد کھڑا چائے سے سنبھالا چکھا تھا۔ اکھڑے ہوئے سینٹ کے فرش پر مختلف عروں کے پانچ لڑکے لڑکیاں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ چائے ایک کالی بھجنگ پیلی میں تھی۔ چائے پینے والوں میں سے کسی کے ہاتھ میں بیٹی کا پیالہ تھا تو کسی کیے سامنے مراد آبادی کوئورا رکھا تھا۔ ایک پانچ کے ہاتھ میں چینی کی پیالی تھی جس کی دستی ٹوٹ چکی تھی۔ ایک لڑکی نے ہاتھوں کو چائے کی پیش سے بچانے کے لئے ایلو موئیم کے ایک ٹیز ہے میز ہے گلاس کو اپنی فرماں میں لے کر اسے دونوں ہاتھوں میں یوں اٹھا کر رکھا تھا کہ اس کا نخسا سا پیٹ دکھائی دے رہا تھا۔ بڑی لڑکی کلکشوم کے سامنے ایک پلیٹ میں لال شکر رکھی تھی جسے نکھیوں نے سیاہ کرڈا لالا تھا۔ وہ کرے ہوئے کناروں والی ایک پرچ میں چائے پی رہی تھی۔ معصومہ میلی چیکٹ شلوار اور قیص پر ایک چھٹی چھٹی دوپٹا اور ٹھنڈے نگہ پاؤں یوں کھڑی تھی جیسے اسے چھولیا جائے تو گر پڑے گی۔ اس کی بھی سیاہ آنکھوں میں خوف گھس گیا تھا اور اس کے گلابی ہونتوں پر نیل پڑ رہے تھے۔

عشرت خامن دروازے میں کھڑی یہ منظر دیکھتی رہیں۔ پھر مسکرا کر نور النساء کی طرف دیکھا تو وہ غائب تھیں۔ "اے بہن نور النساء!" وہ پکاریں۔ جواب نہ پا کر سنجیدہ ہو گئیں اور ادھر ادھر دیکھ کر آگے بڑھ گئیں۔ ساتھ والے کمرے سے برتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس کے دروازے پر پہنچیں تو دیکھا کہ نور النساء جلدی جلدی سے برتن سمیث رہی ہیں۔ "بہن، انہوں نے کہا اور نور النساء سنائے میں آگئیں۔ پھر بولیں۔" یہ باورچی خانہ ہے گر پچوں نے آج اسے کباڑ خانہ بنارکھا ہے۔ ہائے بہن، مجھے تو....."

پھر وہ خاموش ہو گئیں۔ ان کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو خاموش ہو جاتا۔ وجہ یہ تھی کہ عشرت خامن ہنس رہی تھیں۔

مخصوصہ پر لے دروازے میں سے ڈری ڈری جھانک رہی تھی جیسے وہ ایک ایسی گاڑی میں سوار ہے جس کی ایک دوسری لمحوں کے اندر مخالف سوت سے آتی ہوئی گاڑی کے ساتھ نکل رہی ہے۔

عشرت خامنہ اور اب پیٹ پر ہاتھ رکھ کر بینہ گئی تھیں۔ ہائے میرے اللہ! وہ بڑی مشکل سے بولیں۔ ”توبہ ہے!“ انہوں نے بڑی محنت سے ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا اور پھر سامنے دیکھا۔ نور النساء کے ایک ہاتھ میں پتلی اور دوسرا ہاتھ میں اپنا سر تھا۔ اور وہ یوں بینہ گئی تھیں جیسے بینہ کی بینہ رہ گئی ہیں۔

عشرت خامنہ پر بھنسی کا ایک اور دورہ پڑا۔ ”اے بہن! معاف کرنا،“ وہ بولیں۔ ”آپ نے یہ ٹوٹے ہوئے پیالے اور یہ بچکی ہوئی پتیلیاں پہلے کیوں نہیں دکھائیں؟ یہ کالی میملی دیواریں اور یہ پرانے دو پتوں کے پردے آپ نے اوپر کیوں چھپا رکھے تھے۔ یہ نگنے اور ادھرنگے بے دھلے بے نہائے بچے، وہ تو نہ ہوا کھوٹا اور یہ بے کندے کا توا۔ اے بہن! نور النساء آپ نے یہ سب کچھ مجھ سے کیوں چھپایا؟ اور ذرا ادھر تو ہٹئے بہن!“ عشرت خامنہ ادھر کھڑی ہو گیں۔ ”وہ کیا رکھا ہے؟ اچھا تو وہ تمام چیزیں کی چوتھی لگنی پلیشیں ہیں جن کے کناروں پر پھٹے کی دال اب تک جھی ہوئے ہے۔ ادھر مخصوصہ بینی کے کمرے میں جو چار پائی رکھی ہے، اس کی ادواں کو پورا کرنے کے لیے رہی کے ساتھ کسی کا کمر بند بھی تو باندھ دیا گیا ہے۔“

عشرت خامنہ نے یہاں رُک کر دو تین قبیلے مارے۔ پھر آنکھیں پوچھنے کے لیے اپنے دو پنے کو ابھی آنکھوں تک نہیں لے گئی تھیں کہ وہ نور النساء کو یوں آنکھیں چھاڑ چھاڑ کر دیکھنے لگیں جیسے گھنی دھنڈ میں راستہ ڈھونڈ رہی ہیں۔ ”بہن!“ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئیں۔

عشرت خامنہ باور پچی خانے میں داخل ہو کر نور النساء کے پاس بینہ گئیں۔ نور النساء کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں سے پینائی جیسے چوس لی گئی تھی۔

”دیکھئے بہن! مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرتا ہے۔“ عشرت خامنہ نے کہا۔ ”یقچے سیر ہیوں میں۔ الگ سے۔“

نور النساء آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھیں تو ان کی ریڑھ کی ہڈی میں سے چٹاک چٹاک کی دو تین آوازیں آئیں جیسے تیز ہوا میں خشک شہنیاں ٹوٹ رہی ہوں۔

عشرت خامنہ منہ میں دو پنے کا ایک پلوٹھونے اور ادھر ادھر دیکھے بغیر چند سیر ہیاں اتر گئیں۔ پھر رُک کر اوپر دیکھا۔ نور النساء برسوں کے مریضوں کی طرح سیر ہیوں کے جنگل کے سہارے آہستہ آہستہ اتر رہی تھیں۔ جب وہ عشرت خامنہ کے قرب آئیں تو آنکھیں جھکا کر اتر چل گئیں مگر عشرت خامنہ نے انہیں بازو سے پکڑ کر روک لیا۔ پھر انہیں اپنے مقابل کھڑا کر کے منہ سے دو پنے نکالا اور بجائے بولنے کے ہنئے لگیں۔

”جو تیاں مار لجھے بہن عشرت خام۔“ نور النساء کی کہیں دور سے آواز آئی۔ ”پر یہ جو آپ کی بھی.....“

نور النساء آگے کچھ نہ کہہ سکیں کیونکہ نیچے کسی نے دروازے پر دستک دے دی۔ نور النساء بھڑک کر تیزی کے ساتھ نیچے اتریں۔ جب تک وہ سیرھیاں اترتیں، ایک لڑکے نے دروازے کھولتے ہی کڑک کر کہہ دیا۔ ”بی بی جی سلام! آپا جی کہہ رہی ہیں کہ جب مہماں چلے جائیں تو ہمیں جلدی سے بتا دیجئے گا۔ کہتی ہیں قالین اور صوفیہ اور پردے بے شک کل تک رکھے ہیں۔ برتن اور سجاوٹ کی چیزیں ہم آج ہی واپس منگالیں گے۔ صح سویرے ہمارے ہاں بھی مہماں آرہے ہیں۔“

نور النساء آخری سیرھیاں پر جنگلے کو مٹھی میں دبوچے کھڑی تھیں۔ انہوں نے صرف گردان کی جنمیش سے ”اچھا“ کہا۔ لڑکا دھر سے دروازہ بند کر کے چلا گیا اور نور النساء آخری سیرھی پر جیسے گر پڑیں۔

”ڈرائیور!“ عشرت خام زور سے پکاریں اور دیوان خانے کا پرده ہٹا کر اندر جھاٹکتے ہوئے پوچھا۔ ”کیوں اماں جی! کیا ہے؟“ ”میں نے ڈرائیور کو بلا یا ہے۔ تم اندر نیکھو۔“ عشرت خام بولیں۔ ”اور دیکھو۔ صوفے پر احتیاط سے نیکھو۔ کپڑوں میں ٹکن نہ آئے۔ تمہاری سیلی کیا کہے گی کہ مانگ کر پہننے کو لے گئیں اور گنجلا کرو واپس کیے۔“

”اماں!“ ہما کے سینے پر عشرت خام نے جیسے مکا مار دیا۔ پھر وہ تیورا کر پیچھے ہٹ گئی۔

”بڑی بے لحاظ ہوتی ہیں اس زمانے کی لاڑکیاں۔“ عشرت خام نے نور النساء کے پاس آخری سیرھی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ مانگ کے پہنچے یوں پہنچتی ہیں جیسے باپ نے خرید کر دیے ہیں۔ ”پھر وہ ہٹنے لگیں اور ادھر پہنچی بار نور النساء کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ کا پرتو پڑا۔

”ڈرائیور!“ عشرت خام نے اٹھ کر باہر کا دروازہ کھول دیا۔ ڈرائیور سامنے آیا تو وہ بولیں ”بھی دیکھو۔ تم کارو واپس لے جاؤ۔ ہم لوگ نانگ سے آ جائیں گے۔ بیگم صاحب کو سینما دیکھنے جانا ہے تو یہ مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا کہ کار کے مالک تو دوسروں سے کار مانگتے پھریں اور جو ایک گھنٹے کے لیے کار مانگ کر لائے ہیں وہ اس پر قبضہ جما کر بینچے جائیں۔ کہنا بہت بہت شکر یہ۔“ پھر پانچ روپے کا ایک نوٹ بڑھا کر بولیں ”یہ لو تمہارا انعام ہے۔“

ڈرائیور سلام کر کے پلٹ گیا تو عشرت خام دروازہ بند کر کے ہٹنے لگیں۔ پھر وہ اسی طرح ہنستی ہوئی بڑھیں اور نور النساء سے لپٹ کر بولیں۔ اے بہن نور النساء! خدا کے لیے ہٹنے۔ کیا یہ بھی کی بات نہیں ہے کہ انسان اپنی گھر سے نکل کر دوسرے کے گھر جائے تو اپنے ہی گھر جائٹکے۔ اور بہن امیری معصومہ بھی اپنے گھر سے چلے گی تو اپنے ہی گھر جائے گی۔“

اب نور النساء محل کر مسکراہی تھی۔

باہر کار شارٹ ہوئی اور ڈرائیور نے رخصت کا ہارن دیا تو وقار جھپٹ کر دیوان خانے کے دروازے پر آیا۔ ”اماں جی! کار تو جا رہی ہے۔“

”جاری ہے تو جانے دو۔“ عشرت خام بولیں۔ کیا یہ تمہارے باپ کی کار ہے؟“

وقار تیرا کر چھپے ہٹ گیا اور نور النساء پہلی بار قبیله مار کر عشرت خام سے لپٹ گئی۔ دونوں کی نہیں وقار اور ہما کو ایک بار پھر ان دیوان خانے کے دروازے پر کھینچ لائی، جہاں وہ ریشمی پر دہھنا کر بلوں کی گول گول حیران آنکھوں سے دونوں کو دیکھنے لگے۔ اوپر سیڑھیوں کے پہلے موڑ مخصوصہ کھڑی نیچے یوں دیکھ رہی تھی جیسے مداری نے تو کرمی کے نیچے جلا ہوا کاغذ رکھنے کے بعد اس سے کبوتر نکال لیا ہے۔ اور عشرت خام کہہ رہی تھیں ”ہائے بہن نور النساء میرے تو پیٹ میں بل پڑ گئے۔ قلم قرآن مجید کی! پسند سرخی پوڈر بہالے جائے تو نیچے سے کیسے پچ اور کھرے چھرے نکل آتے ہیں۔ ہائے مجھے کتنا پیار آرہا ہے آپ پر۔ آئیے ذرا دیر کو اور باور پی خانے کے ننگے فرش پر جا بیٹھیں۔“



# ثواب

مسجد میں ادھر صبح کی نماز ختم ہوئی، ادھر نقاہ بجھنے لگا۔

آذان سن کر جو لوگ کروٹیں بدلنے لگے تھے نقارہ سنتے ہی تزپ کراٹھے اور گلیوں میں آگئے۔

”یا الہی خیرا“ کہہ کر عورتوں نے کھانوں پر سے پاؤں لٹکایے۔

نقارہ بچے جا رہا تھا اور فضا بیوں گونج رہی تھی جیسے نقارے کے بجائے فضانج رہی ہے۔ ایک مسلسل ”ہم ہم ہم“ کی آواز جیسے گاؤں کو چار طرف سے محاصرے میں لینے کے لیے صبح کے اجائے کے قدم پر قدم بڑھی آ رہی تھی۔

”ہائے کس کا گھر ابڑا گیا نور پیر کے وقت؟“ عورتوں نے گلیوں میں آ کر پوچھا۔

معلوم ہوا جگہ جھیپور کنویں میں گر گیا ہے۔

ماں بیٹا دنوں پانی کھینچ رہے کہ بھرا ہوا بوكا ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ڈھیر رسی جو ان ان کے پاس جمع ہو رہی تھی بھاری بو کے کے گرنے سے ایک دم کچھ تو چکنے کی ایک ٹانگ رسی کے پھندے میں آ گئی اور وہ اپنی ماں کی آنکھ کے سامنے جھپاک سے کنویں میں گر گیا۔ اسے چھیننے تک کی مہلت نہ ملی۔

”ہائے لٹ گئی بے چاری کرمائی جلی۔“ عورتوں نے بے آواز بلند آیں بھریں اور چھتوں پر چڑھ گئیں۔ مرد کنویں کی طرف بھاگنے لگے۔ نقارہ رک گیا اور صبح کا سانو لا چہرہ زرد پڑنے لگا۔

کرمائیں کامیاب ہر صبح کو گاؤں کے عقب میں میلوں تک پھیلی ہوئی ڈھلان کا رخ کرتا جہاں وہ دو پھر تک بھیکڑ کی مجاہریاں اکھیڑتا رہتا۔ یہ سرکاری رکھ تھی اس لیے وہاں کلکھاڑی لے جانا منع تھا۔ دو پھر کو واپس آتا تو اس کے سر پر اتنی بہت سی جھانکڑوں کا انبار ہوتا کہ دوسرے یوں معلوم ہوتا جیسے ایک گھنادرخت چلا آ رہا ہے۔

کرمائیں ان جھاڑیوں سے تور گرم کرتی اور سارے محل کی روٹیاں پکاتی۔ بھٹی جلاتی اور بچوں کی پوٹلیوں میں بندھے ہوئے مکتی اور پچنے کے دانے بھونتی۔ آئے اور داؤں میں سے ذرا ذرا بھاڑائیتی اور یوں میاں بیجوں اور بیٹیں کا پیٹ پلاتا۔

دو پھر کو میاں کے واپس آنے اور تور کو تھنڈا کرنے کے بعد میاں بیجوں دو گھوٹوں پر جندریاں لا دکر کھاتے پیتے گھروں سے گھڑے جمع کرتے اور کنویں پر جا کر پانی بھرتے۔ کنویں کی جگت پر چار طرف رکھے ہوئے شیشم اور توں کے تنوں پر رسیوں کے جولے لبے نشان پڑا۔

چاہیا۔

وہ کہتے تھے کہ ہم بابر بادشاہ کے زمانے سے پانی بھرتے آرہے ہیں اور اب تحکم گئے ہیں۔ اب ہمارا چنگا، مٹی بنے گا اور اگلی نسل تک ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ دوسرا لوگ ہمارا پانی بھریں۔

چنگا چٹی جماعت میں پڑھتا تھا۔ گھروں کا حساب جوڑ لیتا تھا اور ہرات سونے سے پہلے ماں باپ کو کتابوں میں لکھی ہوئی باتیں سناتا تھا تو وہ ان باتوں کو سمجھے بغیر یہ سوچ کر خوش ہوتے رہتے تھے کہ ان کا پیٹا یہ باتیں سمجھتا ہے۔

پھر ایک دور جب کرمائیں سرکاری رکھ میں ایک گلر پر کھڑا ہیکلہ کی ایک جھاڑی کو جھکتے دے دے کر جڑ سے اکھیز رہا تھا تو اچانک اس کی توقع سے پہلے ہی جھاڑی اکھڑا آئی۔ اس کے ساتھ ہی خود اس کے پاؤں بھی اکھڑ گئے اور گلر سے نیچے ایک چٹان پر یوں گرا کہ آس پاس اس کے خون اور بیجے کا چھڑکا ڈھو گیا۔

بیوہ ہو کر بھی ماں نے چنگے کو مدرسے سے نہ اٹھوایا البتہ اس نے تنور کو بیٹھ کے لیے مختندا کر دیا۔ بھٹی جلانے کے لیے وہ خود ہی کسانوں کے ہاں جا کر نامدوں کھر لیوں میں سے مزے ترے نانڈے اور میلا سیلا بھوسہ سمیت لاتی۔ یا پھر ماں بیٹا کنویں پر جاتے اور گاؤں کے کھاتے پیتے گھروں کے لیے پانی بھرتے۔ بھیز سے بچنے کے لیے دونوں منداندھیرے سے پانی بھرنا شروع کرتے اور سورج کے نیزہ بھرا و نیچا ہونے تک فارغ ہو جاتے۔ پھر چنگا مدرسے کی راہ لیتا اور کرمائیں بھٹی کے لیے ایندھن سمیئنے نکل جاتی۔

اور ابھی کرمائیں کو مرے تین میئے بھی نہیں گزرے تھے اور وہ اپنے بیٹے کو بوا کا لکاتے یا سمجھتے ہوئے رہی سے ہٹ کر کھڑا ہونے کا سلیقہ بھی نہیں سکھا پائی تھی کہ چنگے کو بھلی کی سی تیزی سے کھلتی ہوئی رہی نے اپنی لپیٹ میں لے کر پہلے تو کنویں کے سامنے والے حصہ پر پٹھا اور کرمائیں کی جگت پر گر کے بے ہوش ہو گئی۔ اس نے کنویں کے پانی میں اپنے بیٹے کو جھڑاک سے گرنے کی بھی آواز نہ سنی۔ دو اور تھیوں بھی وہاں پانی بھر رہے تھے۔ ان میں سے ایک کرمائیں کے پاس بیٹھ گیا کہیں ہوش میں آ کر کنویں میں نہ کو دجا گئے۔ دوسرا سر پٹ بھاگتا ہوا گاؤں میں آیا۔ گلی گلی میں لوگوں کو اس حادثے کی اطلاع دیتا چلا گیا۔ پھر مسجد میں پہنچ کر جمرے سے نقارہ اٹھایا اور وہیں دہلیز پر بیٹھ کر اسے پاگلوں کی طرح پینئے گا۔

کنویں پہاڑی پر بے ہوئے گاؤں کے قدموں میں تھا۔ لوگ جب کنویں کی طرف بڑھتے تو جیسے انہیں راستے بھول گئے۔ کھیتوں میں

کو دکر وہ بھری فصلوں میں سے بھاگے اور پھر اوپھی اوپھی مینڈوں پر سے لکھتے ہوئے کنویں کی سمت لپکے۔ پورے گاؤں کی عورتیں چھتوں کی منڈیروں پر آئیں تھیں اور کنویں کے قریب سے کامی کاٹیں گھڑیوں کی قطار میں معلوم ہوتی تھیں۔ بچے گلیوں میں سے بھاگے آ رہے تھے۔ پورا گاؤں کنویں پر امداد پڑا تھا۔

کنویں پر سب سے پہلے جھیوڑ، کھار، موچی، مراثی، نائی اور دھوبی پہنچے۔ اس وقت ایک جھیوڑ چنگلے کی ماں کے پاس بیٹھا لوگوں کی طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس کی آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔

”چنگلے! اوپھنگلے!“ اکٹھے بہت سے لوگوں نے کنویں کی جگت پر جھک کر پکارا۔

ان کی آواز گھرے کنویں کی گولائی میں چکر کھاتی ہوئی جیسی نیچے گئی تھی ویسی ہی ایک گونج بن کر اور پر آگئی اور دور تھے میں ایلو مسینیم کی ایک تحالی کی طرح چمکتے ہوئے پانی کی سطح جوں کی توں رہی۔

رسے کے سرے پر ایک گزر بی مضمبوطاً لکڑا باندھ کر اس پر ایک نوجوان غوطہ خور کو یوں بٹھایا گیا کہ رسہ سامنے اس کے ہاتھوں میں تھا۔ رانیں لکڑی پر تھیں اور پاؤں لٹک رہے تھے۔ پھر تین آدمیوں نے رسے کو مضبوطی سے تھاما۔ نوجوان غوطہ خور نے بسم اللہ الرحمن الرحيم پڑھ کر ایک بار کنویں میں دیکھا اور پھر آہستہ آہستہ نیچے اتار جانے لگا۔

لوگوں کو ہجوم مسلسل بڑھ رہا تھا۔ چند جھیوڑ عورتیں بھی روٹی چلاتی آئپھنی تھیں اور کرمائی کے چھینٹے دینے لگی تھیں۔ چند لوگ بچوں کو کنویں کے قریب آنے سے روک رہے تھے۔ اور نوجوان غوطہ خور کنویں کے نصف تک پہنچ گیا تھا۔

لیکا ایک کرمائی ہوش میں آگئی۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ پھر اس کی پتلیوں میں وحشت بھر گئی اور وہ ایک جھنکلے کے ساتھ اٹھی مگر عورتوں نے اسے مضبوطی سے جکڑ لیا۔ پھر وہ ایک دم بچوں کی طرح رونے لگی اور اپنی رانیں کوٹ کوٹ کر پکارنے لگی: ”ہائے میرا چنگا۔ میرا الال = میرا چاند کا لکڑا۔ میرا سونے کا دانہ۔ چنگلے! دے چنگلے! تجھے خدا کا رسول کا داست مرنا نہیں۔ یوں ہستا ہستا باہر آ جائیں مدرسے سے آتا نہیں آتا ہے۔ مرنانہیں میرے بیٹے تو مر گیا تو خدا کی خدائی میں زندہ کون رہے گا۔“

وہ روٹی پیٹھتی اور بین کرتی رہی۔ عورتیں اس کی ڈھارس بندھانے کی بجائے خود بھی روٹی رہیں۔ کنویں کے گراتا ہجوم ہو گیا تھا جیسے میلہ لگا ہوا ہے۔ تمیں چالیس آدمی کنویں کے چار طرف جھک جھک کر ایک دوسرے کو جھک جھک کر دیکھنے سے منع کر رہے تھے۔ اور تاکید بھی کر رہے تھے کہ ایک ذرا سا لکڑ بھی نیچے نہ گرنے پائے ورنہ غوطہ خور کو گولی کی طرح لگے گا۔

سارے ہجوم نے جیسے سانس روک لی۔ کرمائی تک خاموش ہو گئی۔

ادھر ہوا میں ایک ٹیزی ”پیاسی ہوں، پیاسی ہوں، پکارتی ہوئی کل گئی۔“

کنویں پر جھکی ہوئی شیشم کی ایک شاخ سے ایک زرد پتا توٹا اور پھر کی کی طرح چکراتا ہوا کنویں میں اتر گیا۔  
”پچھئیں ملا۔“ پاتال سے آواز آئی۔ ”پھر سے غوطہ لگاتا ہوں۔“

لوگ چمیگوئیاں کرنے لگے۔ کرماں نے بڑی وحشت سے ان کی طرف دیکھا اور پھراپنے سر کے بال نوچتے گئی۔  
”پانی بہت گہرا ہے،“ غوطہ خور پکارا۔ تمہیں تہہ کو نہیں چھو سکا۔ سانس نوٹ جاتی ہے۔ مجھے کھینچ لو۔“

”ہائے بیٹا! ذرا ادھر ادھر کنارے کنارے تو دیکھو۔“ کرماں کنویں پر جھک کر پکاری۔ عورتوں نے اسے بازوؤں سے تحام رکھا تھا۔

”اکھی واپس نہ آ۔ تیری ماں خوشیاں دیکھئے ایک اور غوطہ لگا۔“ پھر وہ رونے لگی اور اس کے آنسو کنویں میں گرنے لگے۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ فقارہ بجانے والا میر جھیور سر پر ایک کھولار کھے بجا گا بجا گا آپنچا۔

”لکھا؟“ اس نے پوچھا۔

”ابھی نہیں،“ کسی نے کہا۔

”دنیں ماں کوئی نشان نہیں۔“

غوطہ خور کنویں میں سے بولا۔ پانی نیزہ نیزہ گہرا ہے۔ میرے قدم تو تہہ پر لگتے ہی نہیں۔ مجھے کھینچ لو۔“

کرماں سینے پر دو ہتھیں مار کر پیٹنے اور جیننے لگی اور لوگ غوطہ خور کو کھینچنے لگے۔

وہ باہر آیا تو ایک اور غوطہ نیچے اتارا گیا۔ اسی طرح باری باری چھ غوطہ خور کنویں میں اترے اور یہ کہتے ہوئے واپس آگئے کہ ”نہ جانے کنویں میں ایک دم اتنا بہت سا پانی کہاں سے آگیا ہے۔ تھا ملتی ہی نہیں۔“

لوگ چار چار پانچ پانچ کی ٹولیوں میں بٹ کر ادھر ادھر بکھر گئے۔ اور کرماں روئی پیٹنی رہی۔

ایک آدمی قریب کے گاؤں کو دوڑا کہ دہاں کے مشہور غوطہ خور کا بلالائے۔ جھیور اور کھمار کنویں پر سے ہٹ آئے اور شیشم کے تنے سے لگ کر بیٹھ گئے۔ کرماں کو بھی عورتیں کچھ پر لے لے گئیں اور تازہ دھوپ میں کنویں کا دہانہ معمول سے زیادہ پھیل گیا۔

کچھ لوگ ٹبلتے ہوئے کنویں سے دور نکل گئے اور پھر گاؤں کے رستے پر ہو لیے۔ گاؤں کی چھتوں کی منڈیروں پر گھریوں کی تعداد بھی کم ہو گئی تھی۔

ملک رحمان خان نے جب نماز اور ادھر و خلاف سے فارغ ہو کر کنویں پر آئے تو کرماں کنویں کی پرلی طرف اسی طرف روپیٹ رہی تھی۔ ان کے ہاتھ میں تسبیح اور ماتحتے پر سجدے کی مٹی تھی۔ آتے ہی انہوں نے کہا ”کرماں بیچاری کر پیٹنے سے روکو۔ روئے بے شک پر پیٹنا جائز نہیں ہے۔“

کسی نے ان کی طرف توجہ نہ دی۔ ملک رحمان نے بھی یہ مشورہ شاید رسما دیا تھا کیونکہ وہ بھی کسی کے جواب کا انتظار کئے بغیر کنوں کی جگت پر آگئے۔ نیچے جھانکا۔ پھر جیسے اپنے آپ کو دھکا مار کر پیچھے ہٹ گئے اور بولے ”ہمارے پہاڑی علاقے کی یہ بڑی بدجخی ہے کہ پانی بہت گہرائی میں ملتا ہے۔ میدانی علاقوں کے کنوں میں تو گھبر و شرطیں لگا کر چلانگیں مارتے ہیں۔ ہمارے کنوں میں تو کوئی گرتے تو آدھے راستے ہی میں مارے خوف کی روح قبض ہو جائے۔“

”آہستہ بولیے ملک جی،“ میر و صحبو ر بولا ”کرمائیں کا تو خیال کیجئے۔“

”تم بھی نہیں ہو میر و؟“ ملک جی نے اس کے پاس جا کر کہا۔ ”نہیں ملابے چارہ؟“

”جی ابھی نہیں،“ میر و بولا۔

”یہ ہمارے گناہوں کی سزا ہے۔“ وہ بولے۔

میر و ہوا میں دیکھتا رہ گیا۔

پھر ملک جی نے کہا ”اور بھی وہ ریت کے تین بورے جو میں نے تم سے لانے کو کہے تھے؟ وہ اگر اگلی صدی میں لانے کے ارادے ہیں تو بھیا، اگلی صدی آئے گی ہی نہیں، قیامت آجائے گی اسی صدی میں۔“

”جی اچھا،“ میر و بولا اور اس تو جوان کی طرف بڑھ گیا جو ابھی ابھی گاؤں سے آیا تھا اور کنوں میں اترنے کے لیے لگوٹ باندھ رہا تھا۔ غوط خور کو کنوں میں اتارنے والے کنوں کے قریب آگئے مگر باقی لوگ گلزاریوں میں بُنے ہوئے باشیں کرتے اور سُلختے رہے۔ جیسے پلیٹ فارم پر ہیں اور گاڑی لیٹ ہے۔

کرمائی غوط خور کو دعا نہیں دینے لگی اور ملک رحمان خان میر و سے یہ کہہ کر گاؤں کی طرف چل پڑے کہ نکل آئے تو قبر کی جلدی کرنا، شام نہ ہو جائے۔ میت دن کو دفن ہو تو اس کی قبر میں روشنی رہتی ہے۔“

ملک رحمان خان گاؤں کی بڑی گلی کی چوٹی والے موز پر پہنچ گئے تھے جب غوط خور کے قدموں نے پانی کو چھوا۔ مگر یہ غوط خور بھی ناکام واپس آیا۔ اور جب تک وہ کنوں میں سے نکلتا، ماحقاً گاؤں کا تامی غوط خور وہاں پہنچ چکا تھا۔

دو پھر قریب تھی۔ شیشم کاتنا جیسے شاخوں کے بکھرے ہوئے سائے کو اپنی طرف سمیٹ رہا تھا۔

کرمائی غوط خور کو یوں دیکھا جیسے عقیدت مند کسی ولی اللہ کو دیکھتے ہیں۔ ”برامشکل کام ہوتا ہے۔“ اس نے پہلی بار اس پاس کی عورتوں سے بات کی۔ ”غوط مارنے والے ماڈل سے بتیں دھاریں بخشوارے پھرتے ہیں۔ خدا ان کا بخت سلطان سکندر رجیسا کرے۔ خدا ان کی عمر خواجہ خضر جتنی کرے۔ یہ اپنی ماڈل کے حلالی بیٹے ہیں۔ ذرا سار کر بولی ”میرے چکنے جیسے۔“ اور پھر بے تحاشا رونے لگی۔

غوط خور چھوٹے قد کا دبلا پتلا جوان تھا۔ اس نے دونوں پاتھوں میں رسائی کرنے کی اساری کے ساتھ ساتھ یوں تیزی سے قدم رکھ کر اترنا شروع یا جیسے گلی میں چل رہا ہے۔ ”رسائی ھیلا چھوڑو۔“ نیچے پہنچ کر اس نے پکارا۔  
رسائی کو ڈھیلا چھوڑ دیا گیا۔

کنویں کی جگت پر فضا کا سنا نہ اتر آیا اور کرمائیں بحمد اللہ میں گرفتی۔

”پانی بہت گہرا ہے بھائیو! دوسرا غوط لگا رہا ہوں۔“ غوط خور نے اطاعت دی۔

غوط خور نے چار غوطے مارے اور جب پانچویں غوطے کے بعد اس نے آواز دی ”مل گیا لڑکا،“ تو دعا میں مانگتی ہوئی کرمائیں کے چہرے پر ایک چمک سیاہ گئی۔ پھر یہ چمک بجھ گئی اور اس کا چہرہ بھیانک ہو گیا۔

کسی نے غوط خور سے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ لڑکا زندہ ہے یا مر چکا ہے۔ غوط خور نے بھی اس سلسلے میں کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔

آنے والے خطرے کے نیچے دبی ہوئی کرمائیں یک چلاٹھی۔ ”کیسا ہے میرا بچہ؟“ غوط خور نے کوئی جواب نہ دیا اور کرمائیں کی آواز گہرے کنویں کو گولائی میں چکر کھا کر جیسی نیچے گئی تھی ویسی ہی ایک گونج بن کر اوپر آگئی۔

”ڈھیل کھینچ لو۔“ غوط خور نے آواز دی۔ ”میں لکڑی پر بیٹھ کر لاش کو رانوں پر رکھ لوں گا۔“

رسائی کھینچنے والے تین آدمیوں نے بھیلی بار پلت کر دیکھا تو کنویں کے مضائقات خالی ہو چکے تھے۔ وہ جہاں ایک میلہ سالگ گیا تھا اب وہاں شیشم کے پتے اڑ رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے سارے گاؤں کی آبادی چکے سے کنویں میں اتر گئی ہے۔ بس چند بچے ایک طرف سے ہوئے کھڑے تھے۔ دور گاؤں کے مکانوں کی منڈیریں نیلے آسمان کو خط مستقیم میں کاٹ رہی تھیں۔

”لوگ کہاں گئے؟“ مہر و محیور نے حیران ہو کر پوچھا۔

پھر ایک آدمی نے غوط خور کو اطلاع دی ”ن جانے لوگ ایک دم کہاں چلے گئے ہیں۔ ہم کل تین آدمی ہیں۔ دو کو کیسے کھینچیں؟“ ”لوگ تھے کہاں؟“ غوط خور بولا ”میں توجہ آیا تمہیں تین تھے یا ماں تھی یا کچھ بچے تھے۔“ کس کو پڑھ بھی نہیں چلا تھا اور لوگ گاؤں واپس جا کر اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے تھے۔ گھروں سے دھواں انہر رہا تھا۔ ریوڑ آس پاس کی پہاڑیوں پر چر ہے تھے اور دور ایک چھت پر کوئی عورت دھلتے ہوئے کپڑے سکھانے کے لیے پھیل رہی تھی۔

کرمائیں کچھ دیر تک گاؤں کو اپنی بھیانک آنکھوں سے دیکھتی رہی۔ پھر وہ نچلے ہونٹ کو دانتوں میں لے کر رہے والوں کے پاس آئی۔ لاو میں کھینچوں گی۔“

تینوں جھیو روں کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ پھر ایک نے پھول کو بلایا۔ وہ بھاگتے ہوئے آئے اور رسم سے چمٹ گئے۔ کرمان بننے پر

باتھر کے ایک طرف کھڑی رہی۔

آہستہ آہستہ رسائی پھیتارہ۔ کنوں کے آخری خطے پر غوط خورنے چلے کی لاش اپنی رانوں پر سے اٹھائی مگر اب اسے لینے والا کوئی نہ تھا۔ سب سے کوئی پھیپھی کھڑے تھے۔

پھر کرمان آگے بڑھی اور گھنٹوں کے بل بیٹھ کر اور بازو پھیلا کر بولی ”میرے اس پھول کو یہاں میری جھوٹی میں ڈال دے میرے میئے۔“

کرمان چلنے کی لاش کو بازوؤں میں لے کر اٹھ کھڑی ہوئی اور گاؤں کی طرف یہ کہتی ہوئی چل پڑی۔ ”چل میرے پنج۔ مدر سے جانے میں دیر ہو جائے گی۔“

میر و کھولا اٹھا کر بھاگا آیا اور کرمان کے سامنے راست روک کر کھڑا ہو گیا۔

کرمان نے چلنے کا کاٹھ کے سامان کی طرح بڑی احتیاط سے کھنلوں پر رکھا اور پھر بولی ”تم تو تین ہو۔ جنازہ تو چار اٹھاتے ہیں۔“

پھر کسی کو سامنے سے ملک رحمان خاں آتے دکھائی دیے۔ قریب آ کر وہ بولے ”میں سمجھتا تھا بہت سے لوگ ہوں گے ان سے بات کروں گا۔ مگر یہاں تو تمہی تین چار ہو۔ سب چلے گئے تھک کر صبح سے آئے ہوئے تھے۔ اور اب تو ظہر کی آذان ہونے والی ہے۔“

اب ملک رحمان خاں کھنلوں کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ”بات یہ ہے بھی“ انہوں نے کہا۔ کہنا یہ تھا کہ کفن دفن کے بعد تم لوگ بیٹھ کنوں پر رواپس آ جانا۔ جنازے پر میں لوگوں سے بھی کہہ دوں گا کہ سب کنوں پر چلیں۔ لاش نکل آئی ہے تو کنوں کو پاک بھی کر لینا چاہیے۔ دوسو بوکے نکالے ہوں گے۔ تم جھیو روگ بوكا خوب کھینچتے ہو۔ اسی لیے تم سے کہہ رہا ہوں اور پھر یہ ثواب کا کام بھی ہے۔“



# حدامن فضل ربی

اس چھوٹی سی سڑک کو بلد یہ ”پام لین“ کہتی ہے۔ وہ برس قبل میں نے اسے ”خیلستان“ کہنا شروع کر دیا اور اب کیفیت یہ ہے کہ چند روز پہلے اسی سڑک پر ایک ہر کارہ ”پام لین“ کا راستہ پوچھتا پھر رہتا۔ کہیں یہ نہ سمجھے بیٹھے گا کہ خیلستان کے بنگلوں پر بھوروں کا چھتریاں سائیہ کیے ہوئے ہیں۔ جی نہیں۔ یہاں یوں کہنے ہے، شیشم ہے، شیشم ہے مگر بھور کا کوئی ایک بھی پیر نہیں کہتے جیں پرانے زمانے میں یہاں کسی کا مزار تھا اور اس مزار کے احاطے میں بھور کا ایک درخت ہر وقت آسمان کی طرف انگلی اٹھائے کھڑا رہتا تھا۔ پھر جب شہر پھیلا تو مزار کے متولی نے احاطے کو مزار سمیت پیچ ڈالا اور کسی دوسرے میں مزاری نکل گیا۔ یہاں ایک بیگنے تعمیر ہوا۔ نہ جانے اس بیگنے کا اصل مالک کون تھا مگر مجھے اتنا یاد ہے کہ ابا جان مرحوم نے یہ بیگنے ایک دیوالیہ ہندو سینھ سے خریدا اور اس کے ماتحتے پر سے ”رام نواس“ کے الفاظ مٹا کر ”حضر امن فضل ربی“ کی تحریک کی ہے۔

کہتے ہیں اس احاطے کا خریدار بڑا خوش ذوق آدمی تھا۔ اس نے مزار کو تو ہمار کردیا مگر بھور کے درخت کو نہ چھیندا۔ اس کی رائے میں صرف اس ایک درخت نے سارے بیگنے کے ماحول کو الیسوی رنگ دے رکھا تھا۔ بلد یہ نے اسی درخت کی رعایت سے اس چھوٹی سے سڑک کا نام ”پام لین“ تجویز کیا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعد میں بیگنے کی کسی مالک نے اس درخت کو کاٹ کر اس سے اپنے گیراج کی چھت کے شہتیر کا کام لیا۔ ابا جان مرحوم نے اس شہتیر کو نکلا کو وہاں لو ہے کا گڈر لگوادیا اور شہتیر اپنے ایک مضراب کے ہاتھ پیچ دیا۔ یہ مزارع ہماری زمینوں پر اپنے لیے ایک کھڑیا کھڑی کرنا چاہتا تھا۔ مجھے یاد ہے میں نے ابا جان مرحوم سے کہا تھا۔ کہ پرانا دیمک خورده شہتیر ہے اور آپ نے اسے گیراج سے اسی لیے نکلا یا ہے کہیں چھت گر کر موڑ کار کر پچکا نہ دے۔ اس لیے بیچا کے کو منت دے دیجئے۔ کڑک کر بولے ”کیا وہ ہماری زمینوں کی مفت دکھ بھال کرتا ہے کہ میں اسے اتنی بہت سی لکڑی مفت میں دے دوں؟“ خدا بخشنے ابا جان مرحوم بڑے دل گلی باز تھی۔

تو وہ میں عرض کر رہا تھا کہ میرا بیگنے خیلستان میں ہے اور میں ”حضر امن فضل ربی“ میں تھا۔ تھا ہی سمجھئے کیونکہ چار نو کروں اور ان کی بیویوں اور پچھوں کو ساتھ بھی کوئی ساتھ ہے، البتہ سال ڈیڑھ سال پہلے جب میں نے خوشیا کو مالی رکھا تو میری تھائی میں ذرا سی جھری پیدا ہوئی۔ وہ بیوں کے خوشیا نے آتے ہی میرے بیگنے کے لان اور پچھوں پھلوواری پر بیوں لگ کر محنت کی کہ اب بھی سوچتا ہوں تو جیرت ہوتی ہے۔ صحیح منہ اندھیرا آتا تھا اور شام کے جھٹپٹے میں واپس جاتا تھا۔ میں نے ایک دن خوش ہو کر اسے دس روپے انعام میں دے دیے۔ تمیں

چار دن کے بعد پھر دس روپے دیے۔ چند دن گزرے تو پھر دس روپے تھا دیے۔ انعام و اکرام کی اس فراوانی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میر کو بھی کا لان بہت خوبصورت ہو گیا تھا اور ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کی بیوی بہت خوبصورت تھی۔ اتنی خوبصورت کہ اب بھی میں سوچتا ہوں تو ہاتھ سگریٹ کیس کی طرف بڑھتا ہے۔ مجھ میں ناشتہ کر کے لان میں نکلا تھا تو خوشیا تھا اٹھا کر اور اس کی بیوی آنکھیں جھکا کر مجھے سلام کرتے تھے اور اپنی نظروں کے ساتھ میری نظروں کا تعاقب کرنے لگتے تھے جیسے اپنی محنت کی داد مانگ رہے ہیں اور میں داد دینے میں بخل سے کام نہیں لیتا تھا۔ بھی دس کا نوٹ، کبھی پندرہ کے نوٹ۔ میں نے انہیں اتنا انعام دیا کہ وہ انعام لینے سے گھبرا نے لگے۔ مگر میں انعام دیتا رہا۔ بات یہ ہے کہ خوشیا انعام لیتا تھا تو اس کا رنگ اڑ جاتا تھا مگر اس کی بیوی کے چہرے پر اکٹھے بہت سے رنگ آ جاتے تھے۔ ایک دن کیا ہوا کہ میں لان میں ٹھیلنے لکلا تو مجھے خاشیا کہیں نظر نہ آیا۔

صرف اس کی بیوی ایک طرف کھرپا چلا رہی تھی۔ وہ سر جھکائے اٹھی اور سر جھکائے بیٹھ گئی۔ ایسا لگا جیسے مالن نے میرے ہونٹوں سے لگا ہوا پانی کا گلاس چھین لیا ہے۔ آج میں نے اس کی آنکھوں کے جھکنے کا منظر بھی نہیں دیکھا تھا تا اس لیے عجیب تھکنی میں محسوس ہونے لگی۔ سوچا، شوہر کے بغیر کچھ زیادہ ہی شرمارہ رہی ہے۔ ابھی خوشیا آئے گا اور میں اسے انعام دوں گا تو سب تھیک ہو جائے گا۔ میں برآمدے میں آبیخا تو ذرا دیر کے بعد وہ آئی۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں گلاپ کے پھول تھے اور آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ اسی حالت میں وہ بیوی۔ کیوں؟ ”بولی“ نہیں جی۔ جہاں آپ سوتے ہیں۔ مالی آج یہاں رہے۔ اس نے کہا ہے کہ آپ کے سونے والے کمرے میں یاد سے پھول لگا دوں۔

مجھے شرارہت سوچھی۔ میں نے پوچھا ”پھول کہاں ہیں؟“ اس نے پہلی بار مجھے دیکھا اور دونوں ہاتھوں کی ذرا سا بلکر بولی ”یہ ہیں۔“ (یقین کیجئے اتنی کالی اور بڑی اور ڈبڈ بائی آنکھیں میں نے صرف تصویروں میں دیکھی ہیں)۔ میں نے کہا ”کہاں ہیں؟“ مجھے تو نظر نہیں آ رہے ہیں۔ مجھے تو صرف ایک پھول نظر آ رہا ہے۔ اس کی گلکنی بندھ گئی تو میں نے کہا۔ مجھے تو بھی صرف ایک پھول نظر آ رہا ہے۔ مجھے تو صرف قم نظر آ رہی ہو۔“

اس کے چہرے پر گلاپ ہی گلاپ کھل گئے اور گلاپ کے پھول اس کے ہاتھوں سے گر پڑے۔

جی نہیں۔ وہ میری طرف نہیں بڑھی۔ مظہن کا تقاضا بھی یہی تھا۔ اور میں نے انہیں انعام سے بھی مالا مال کر دیا تھا۔ مگر وہ پلگی تو بھاگ کھڑی ہوئی۔ لان میں بھی نہیں گئی جہاں اس کا کھرپا اور قپچی وغیرہ رکھے تھے۔ وہ سیدھی باہر گئی اور اس کے بعد کوئی ڈیرہ سال ہونے کو آیا ہے نہ وہ آئی ہے نہ خوشیا آیا ہے۔ اپنی تجوہ تک لینے نہیں آئے۔ احقوں کو میری کوئی بات بری لگ گئی۔ اب بھی ان کی یاد آتی ہے تو منہ کا ذائقہ ایسا لطیف ہو جاتا ہے جیسے الائچی کھائی ہو۔ خدا جانے آج کل کہاں ہیں۔ نیکیں اسی شہر میں ہوں گے۔ مگر نہ جانے کس ہنگلے میں

ہیں۔ بہر حال جہاں رہیں خوش رہیں۔ ذرا سابے وقوف تھے ورنہ اچھے لوگ تھے۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ میں ”طہر امن فضل ربی“ میں تینا رہتا ہوں۔ خیلستان چار بنگلوں پر مشتمل ہے۔ یہ بنگلے ایک قطار میں ہیں۔ ان کے سامنے سے گزرتی ہوئی سڑک کے اس طرف شیشم کے درختوں کا ایک گنجان ذخیرہ ہے۔ پہلا بنگلہ میرا ہے اور چوتھا سجاد کا ہے۔ سجاد میرا پر ان لگوں نیا یار ہے مگر اس سے میری بول چال آج تک بندھی اور اس کی وجہ معمولی نہیں۔ سجاد کے بنگلے سے آگے کھیت شروع ہو جاتے ہیں۔ اس لیے یہ بنگلے خیلستان کی چھوٹی سی سڑک کا زمینیں ہے۔ ویسے کھیت والوں کے ساتھ اس کے تعلقات اتنے اچھے ہیں کہ ضرورت پڑے تو کار کو کھیتوں میں سے گزار کر چار انج فر لائگ پرے ایک کچی سڑک تک لے جاتا ہے جو شہر کے لیے اچھے خاصے شارت کت کا کام دیتی ہے مگر میں نے اس سے ہمیشہ بحث کی ہے کہ شارت کت کی ایجاد پیدل چلنے والوں نے کی ہے اور موڑ کار والوں کو اس سے کوئی واسطہ نہیں، ہونا چاہیے مگر نہیں مانتا۔

بہر صورت دو برس پہلے کی بات ہے کہ ایک دن میں اپنی کار میں شہر کی طرف سے آیا۔ اپنے بنگلے میں مڑھی رہا تھا کہ پیچھے سے سجاد اپنی چھوٹی کار میں ایسا اور میری کار کے ایک پچھلے پہنچے کامڈگارڈ اور ہیز کا چلتا بنا۔ میں اگر حواس قائم نہ رکھتا تو میری کار اپنے بنگلے کی حد بندی سے تکرا کر سامنے سے بھی پچک جاتی مگر میں نے حد بندی سے بس کوئی ایک انج کے فاصلے پر رکاروک لی۔ اتر اور کار کے پیچھے جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک مڈگارڈ کا غز کی طرح پھٹا ہوا ایک طرف لٹک رہا ہے۔ میں نے یہ کار بلیک میں خریدی تھی۔ پچیس ہزار میں اور اب مجھے بلیک میں اس سے کہیں زیادہ دام مل رہے تھے مگر میں اسے بیچنے کو تیار نہیں تھا۔ بہت کم اتنی اچھی کار میں مریے ہاتھوں سے نکلی ہیں۔ اور ہذا ہوا مڈگارڈ دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا۔ خیلستان کے آخری سرے کی طرف نظر اٹھائی تو یہ دیکھ کر خوشی سی ہوئی کہ سجاد کی کار بھی باہر رہی رکی کھڑی ہے۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی کار کو بھی کوئی نقصان پہنچا ہے اور نہ کیوں رکتی۔ مگر یہاں ایک اس خوشی پر غصہ غالب آگیا اور میں کار میں سے نکل کر سجاد کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سجاد ویل کے سامنے بیٹھا ہنسی سے بے حال ہو رہا ہے۔ اس کا سارا خون اس کے چہرے اور کانوں میں مجمع ہے۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ پیٹ کو ہاتھوں سے دبارکھا ہے مگر ہنستے جا رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ اپنی سیٹ پر کو دپڑا اور اس زور کا قہقهہ مارا جیسے اس کے پھیپھڑے کی دھیاں اڑ گئی ہیں۔ پھر رہا تھا باہر نکال کر اپنی کار کا تھپتھپایا جیسے گھوڑ دوڑ میں اول آنے والے گھوڑے کو تھپتھپاتے ہیں۔ میرے تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ تو اس نے اپنی کار میرے مذاق اڑانے کے لیے روک رکھی ہے!

چوری بھی اور سینہ زوری بھی!

میں نے گرج کر کہا۔ ”کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم نے میری کار کا مڈگارڈ اور ہیز کر کھدیا ہے؟“

وہ بڑی مشکل سے ہنسی پر ضبط پاتے ہوئے بولا۔ ”تو میں ہنس کیوں رہا ہوں؟“

”بڑے حرامزادے ہیں آپ“ میں نے کہا۔

وہ بیکا یک سنجیدہ ہو گیا۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ مجھے گورنے لگا اور پھر ایک دم شدت سے ہنتے لگا۔  
میں نے کہا۔ ”بڑے الو کے پٹھے ہیں آپ۔“

وہ پھر سنجیدہ ہو گیا مگر اب کہ سنجیدہ ہی رہا۔ کار کو اسٹارٹ کر کے اپنے بیٹگلے کے اندر یوں لے گیا جیسے کا نہیں چلائی، راکٹ چھوڑا ہے۔  
میں وہیں کھڑا تھا۔ جب اس نے پورچ میں بریکیں لگا کر کار روکی اور پیسوں سے اتنے زور کی چینیں بلند ہو گیں کہ اس کے سب ملازم اس کی  
طرف بھاگے۔ پھر اس نے کار میں سے نکل کر ادھر کا دوازہ اس زور سے بند کیا کہ ادھر کا دورازہ کھل گیا اور وہ پاؤں پختا ہوا اندر چلا گیا۔

تیری ایسی کی تیسی! میں نے سوچا اور وہاں سے چلا آیا۔ اس کے بعد بیگل نمبر 4 میں آج تک نہیں گیا اور نہ سجادہ میرے پاس آیا۔  
تو میں عرض کر رہا تھا کہ سجادہ سے میری بول چال یوں بند ہوئی۔ بہر حال سجادہ کو ماری گولی۔ مجھے تو دراصل دو بیگلوں کو ذکر کرنا تھا۔ ان  
میں سے میرے بیٹگلے سے ملٹی بیگل ایک سابقہ خان بہادر کا ہے جو آزادی کے بعد اپنا خطاب تو قہر درویش بر جان درویش واپس کر چکے ہیں  
مگر کہلاتے خان بہادر ہی ہیں۔ بیگل نمبر 3 ایک ایسے صاحب کا ہے جو آزادی کی وجہ سے خان بہادر ہوتے ہوئے رہ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ  
ان کا عصی نظام خراب ہو گیا۔ پھر ختم ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی وہ بھی ختم ہو گئے۔ یہ تو میں بتاچکا ہوں کہ بیگل نمبر 4 میں دو برس سے میرا آتا  
جانا بند ہو چکا ہے۔ رہے باقی دو بیگلوں تو وہاں میرے جانے یا وہاں سے کسی کے میرے یہاں آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ بیگل نمبر  
2 کے خان بہادر صاحب سنگی سے آدمی ہیں۔ بیٹگلے کے ایک پچھلے کمرے میں دن رات بند رہتے ہیں اور کئی برس علم ہندسہ کی کوئی نئی شاخ  
ایجاد کرنے کے درپے ہیں۔ رندوے ہیں، دوسرا شادی کرنے سے پہلے عشق کر رہے ہیں۔ ناکام رہے اور علم ہندسہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ کبھی  
کبھی اپنی کئی گز لمبی کار انگلیوں پر کچھ لگتے نظر آتے ہیں۔ ان کے علاوہ اس بیٹگلے میں ان کی اکلوتی بیٹی تابندہ رہتی ہے۔ نفیات کا ایم۔ اے  
پاس ہے اور جب دیکھو۔ لان میں بیٹھی پڑھتی نظر آتی ہے۔ میرے علاوہ بیگل نمبر 3 والوں کی طرح ان کی بھی کئی مرلح زمین ہے بلکہ ان کے  
تو چند راپورٹ کمپنیوں میں حصے بھی ہیں اس لیے چار پانچ ہزار ماہانہ آ جاتا ہے۔

بیگل نمبر 3 کے مالک تو جل بے ہیں البتہ ان کی بیوی زندہ ہیں۔ انہیں اپنی کوٹھی کے لان میں پھولوں کی بجائے سبزیاں اگانے کا شوق  
ہے۔ ایک بار کدو کی ایک بیتل لپک کر بیٹگلے کی حد فاصل پر چڑھ گئی اور پرلی طرف سجادہ کے لان میں اتر گئی۔ ظاہر ہے کہ اس میں بھی پھول  
آئے اور کدو لگئے اور یہ کدو حجاد کے نوکروں نے اتار لیے۔ کسی طرح بی بی جی اس کو چوری کی اطلاع مل گئی۔ انہوں نے اس پر وہ آفت  
چائی، وہ آفت چائی کہ ادھر لان میں اپنے مالی کے کندھوں پر بیٹھ کر سجادہ نے انہیں سلام کیا، کان پکڑنے، معافیاں مانگیں اور بازار سے کدو  
منگا کر انہیں بھجوائے۔ یوں یہ معاملہ ختم ہوا اور نہ وہ تو ”رٹ“ کرنے چلی تھیں۔ ان کی بھی ایک اکلوتی بیٹھی ہے۔ نام شفقتہ ہے مگر پڑھ مردہ

تخلص کرتی ہے۔ ایف۔ اے میں برسوں تک فلی ہوتی رہی توالہ شرقیہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ان دنوں ہر سال ادیب فاضل کا امتحان دیتی ہے۔ پرچے میں غالب کو کوئی شعر لکھنا ہوا اور وہ اسے یادنہ ہو تو وہیں امتحان کے کمرے میں ارجمندًا شعر لکھتی ہے اور غالب کے سر تھوپ کے چلی آتی ہے۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ خیلستان میں کل چار بنگلے ہیں۔ چاروں اتنے خاموش ہیں کہ اگر اپنے بنگلے میں لیٹئے ہوئے کھانسی آنے لگی تو یہ خوف رہتا ہے کہ کہیں باقی تینوں بنگلوں میں سوئے ہوئے لوگوں کی آنکھ نہ کھل جائے۔ چاہ بنگلوں کی اپنی اپنی کاریں ہیں۔ سجادہ زینداری کے علاوہ ایکسپورٹ کا کام بھی کرتا ہے اس لیے اس کے ہاں شہر سے بھی کاریں آتی رہتی ہیں۔ باقی تینوں بنگلوں میں بفتے میں ایک آدھ بار کوئی ملنے والا آنکھتا ہو گا۔ خیلستان میں بزیک بس اتنی ہی ہے۔

ایک روز کسی معاشرتی ادارے کا کارکن سائکل پر میرے بنگلے میں آیا اور مجھ سے ملنے کی خواش ظاہر کی۔ میرے ملازم نے یہ کہہ کر اسے ٹالنا چاہا کہ صاحب سور ہے ہیں۔ ملازم بے چارہ کیسے کہتا کہ تم سائکل پر آئے ہو؟ اس لیے ہمارے صاحب سے تمہارا کیا کام ہو سکتا ہے۔ کارکن بولا کہ وہ تو بنگلے کا نام پڑھ کر اندر آ گیا تھا۔ میں نے یہ بات سن لی۔ سچ کہوں، شرم آگئی۔ آنکھیں ملتا ہوا بہرآ گیا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور بے نام بے پتے کا ایک دعوت نامہ دے کر پوچھا "کیا آپ آنسہ ٹکفتہ بانو پر شمردہ کا پتہ بتاسکیں گے؟ میں نے اسے بلکن نمبر 3 میں جانے کو کہا اور وہ چلا گیا۔

یہ دعوت نامہ ایک معاشرتی ادارے کی طرف سے منعقد ہونے والے کسی ورائی شو میں شرکت کا تھا۔ ڈرامے اور گانے اور مشاعرے کا پروگرام تھا۔ سوچا چندے وندے کا لائچ ہو گا، اس لیے دعوت نامے یوں بغیر کسی نام و نشان کے بانٹے جا رہے ہیں۔ میں نے طے کر لیا کہ پروگرام میں ضرور شرکت کروں گا۔ (آخر گانے کا پروگرام بھی تو تھا) اور کسی نے چندہ مانگا تو دس پندرہ دے دوں گا۔ (مجھے یہاں لیکا یک اپنامی اور مان یاد آ گئے۔ اچھے لوگ تھے بے چارے) میں یہ دعوت نامہ کہیں رکھ کر بھول گیا۔ تاریخ تو یاد رہ گئی تھی مگر وقت اور پتہ کون بتائے۔ پھر یاد آیا کہ کارکن ٹکفتہ بانو کو بھی دعوت نامہ دینے گیا تھا۔

میں سلپینگ گاؤں اور سلپر ووں سے بے پرواہ کر بلکل نمبر 3 کی طرف نکل گیا۔ بنگلے کے لام کو کدو اور کریلے وغیرہ نے ڈھانپ رکھا تھا اور ٹکفتہ بانو لان کے ایک سرے پر آرام کری میں لیٹی کچھ پڑھ رہی تھی۔ اس کی پیٹھے میری طرف تھی اس لیے آرام کری نے اسے چھپا رکھا تھا۔ میں نے ٹکفتہ کو اس کے بازو سے پہچانا۔ حسن کے معاملے میں میرا نقطہ نظر میرا اپنا ہے۔ مجھے نہ جسم کی ساخت متوجہ کر سکتی ہے۔ اور نہ چال کی باضابطہ بے ضابطی۔ میں صرف چہرے دیکھتا ہوں مگر آج پہلی بار ٹکفتہ کا بازو دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ حسن کا کوئی مرکز نہیں ہوتا۔ یہ منتشر شدم کی کیفیت ہے اور مجھے اس ہم جماعت کا مذاق اڑانے کا افسوس ہے جو ایک لڑکی کے پاؤں دیکھ کر اسے دل دے بیٹھا تھا۔ یہ بازو

اتا سذول تھا کہ اگر مجھے اروडغت مرتب کرنے کی توفیق ہوتی تو لکھتا کہ سذول شفقت کے بازو کو کہتے ہیں۔ کدو اور کریلے کے پس منظر میں اس کے بازو کے چمکتے ہوئے خطوط مجھے کبھی نہیں بھول سکتے۔ (نہ جانے وہ ماں کہاں چل گئی ہے چاری)۔

میں نے شفقت کے پاس جا کر کہا ”کیا میں حاضر ہو سکتا ہوں؟“

اس نے مجھے پہچان لیا۔ میرے سوال کا جواب دینے کے بعد اٹھ کھڑی ہوئی اور پکاری ”امی جان! یہ پہلے بھگے والے صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔“

میں نے کہا ”میں تو آپ سے ملنے آیا ہوں۔“

”کون کس سے ملنے آیا ہے؟“ اس کی امی جان ہاتھوں میں کھر پا اور چہرے پر استفہامیے لیے کریلے اور کدو کے ڈھیروں میں نکل پڑیں۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ کھر پاز میں پر پھینک کر بڑی طویل و عریض مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔ ”آئیے تشریف رکھیے۔“

مجھے کہنا تو نہیں چاہیے تھا مگر کہہ بیٹھا ”افسوں ہے مجھے کھر پر بیٹھنا نہیں آتا۔“

پہلے تو دونوں دم بخود رہ گئیں۔ پھر بے قرار ہو کر نہیں اور دیر تک نہتی رہیں۔

آج بھی وہ اسی بے قراری سے نہتی ہیں اور دیر تک نہتی ہیں۔ میں جب روزانہ صبح کو کار لے کر شفقت کے ہاتھوں تو وہ نائیلوں کی ہلکی بیز سازی میں ملبوس میرے انتظار میں بجندے یاں توڑ رہی ہوتی ہے۔ (مجھے ہلاکا بیز رنگ بہت بھلا لگتا ہے۔) مجھے دیکھتے ہی اس کا چہرہ بھی پر ضبط کے مارے سرخ ہو جاتا ہے اور وہ پکارتی ہے۔ ”امی! فضل ربی صاحب آگئے۔“ کدو کی بیلوں میں سے آواز آتی ہے۔ ”تو پھر انہیں بٹھاؤ کھر پے پر، پھر ہم تینوں زور زور سے ہستے ہیں اور بڑی بی کو وہیں بیز یوں ترکاریوں میں چھوڑ کر کار میں جیٹھتے ہیں اور سڑک پر آ جاتے ہیں۔

کبھی میں کار چلاتا ہوں اور شفقت میرے ہاتھوں میں الگیوں سے لگھی کرتی ہے اور میری نائی کی ناث کو کستی اور ڈھیلا کرتی رہتی ہے۔ کبھی شفقت کار چلاتی ہے اور میں اس کے بازوؤں کا دیکھتا ہوں اور انہیں سہلا تا ہوں اور ان سے اپنا چہرہ ملتا ہوں۔ شفقت بہت پیاری لڑکی ہے۔ (جب تک کسی عورت کی شادی نہ ہو جائے میں اسے لڑکی کہنا پسند کرتا ہوں) وہ میری پہلی دریافت ہے۔ (سوچتا ہوں زندگی میں کبھی ایک بار کہیں سرار ہے اس ماں سے میری مذہبیت بھیز ہو جائے تو مرا آجائے)۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ شفقت بیگنے نمبر 3 میں رہتی ہے۔ ایک صبح کو میں روزانہ کے پروگرام کے مطابق شفقت کو بیگنے نمبر 3 میں اتار کر کھر پہنچا۔ کھانا کھایا۔ سگریٹ پینے لگا تو سگریٹ لائر غائب تھا۔ یک آیا کہوا پسی پر لائر شفقت کے ہاتھوں میں تھا اور وہ اسے جلا جلا کر مجھے بار

بارہ مکی دیتی تھی کہ ”جلادوں تھہاری موجود چیز؟“ (جی ہاں! میری موجود چیزیں ہیں)۔

لائٹ لینے شگفتہ کے ہاں گیا تو معلوم ہوا کہ وہ بیگنگ نمبر 2 میں تابندہ نیگم کے ہاں گئی ہے۔ گھر واپس آ کر ملازم کو بیگنگ نمبر 2 بھیجا چاہا مگر پھر سوچا، شگفتہ محسوس نہ کر بیٹھے۔ خود جانا چاہیے۔ خود چلا گیا۔ ملازم نے اندر اطلاع دی۔ پھر مجھے ڈرائیکٹ کچھ نہ ہوا۔ شگفتہ وہاں ہوتی تو تیرا نام سن کر فوراً جاتی یا کم سے کم اپنی موجودگی کا ثبوت ضرور دیتی۔ مگر دیر تک کچھ نہ ہوا۔ میں اس کے انتظار میں دروازے کے پردوں کو کنکلی باندھے دیکھتا رہا۔ بڑے عجیب پرداز تھے۔ ان پر اوپر سے نیچے تک چھپی ہوئی تصویروں میں سے کوئی ایک بھی دوسری سے نہیں ملتی تھی۔ کہیں عورت دو دھوپ بلوہی تھی۔ کہیں کھار چاک پر کوزہ بنارہا تھا۔ کہیں میراثی ڈھول پیٹ رہا تھا۔ ایک کسان ہل چلا رہا تھا۔ ایک کو خوچل رہا تھا۔ ایک دیہاتی لڑکی دھن بنی بیٹھی تھی۔ ایک گھروندے میں سے وہاں نکل رہا تھا۔ غرض قسم کے دیہی مناظر کی بساط بچھی ہوئی تھی۔ ثابت ہوا کہ تابندہ نفیات کی طالب علم ہی مگر آثار قویہ کی بھی دلدادہ ہے۔ (میں دیہات کو اپنے ملک کے آثار قدیمہ میں شامل کرتا ہوں کیونکہ مجھے یقین ہے کہ جب بابر نے حملہ کیا تھا جو جب بھی یہ دیہات ایسے ہی تھے)

لیکا یک مجھے محسوس ہوا کہ کمرے میں کسی نے عطر انڈیل دیا ہے۔ پلٹ کر دیکھا تو تابندہ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ وہ ایک اور دروازے سے چپکے سے اندر آگئی تھی۔ میں تڑپ کر کھڑا ہو گیا اور بولا ”معاف کیجئے گا۔ میں آپ کے پردازے دیکھ رہا تھا۔“

”میرے پردازے؟“ تابندہ نہ کربولی ”جی نہیں، میرے ڈرائیکٹ روم کر پردازے۔“

میں جھینپ کر مسکرا یا تو وہ بولی معاف کیجئے گا، آپ کو اتنی دیر تک انتظار کی زحمت گوارا کرنا پڑی۔ دراصل میں انسانی رشتؤں کی نفیات کے موضوع پر ایک کتاب پڑھ رہی تھی جس کا آخری باب ختم ہونے کو تھا اور میں ختم کر کے اٹھی۔ (کیا اپ تنک لگانا اور عطر جتنا چھڑ کنا نفیات کی ہر کتاب کا آخری باب ہوتا ہے؟) ”یہ نفیات ایسا موزی علم ہے کہ ایک آدھ کڑی غائب ہو جائے تو سارا ڈھانچہ بکھر جاتا ہے۔ آپ کو بھی نفیات کے مطالعے سے یقیناً ڈھنپی ہو گی۔“

”جی ہاں۔“ میں نے کہہ دیا حالانکہ جاسوںی ناول نفیات میں شامل نہیں ہوتے۔

”تشریف تو رکھئے نا۔“ وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی ”آپ تو کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ اچھا یہ بتائے کون کون سی کتابیں پسند ہیں آپ کو؟“

”یہ پوچھئے کون کون سا انسان پسند آئے؟“ میں بس کر کہا۔

(بھتی نہ جانے وہ مالن میرے دماغ میں بیٹھی کھرپے سے کیا کر رہی ہے!)

”آپ تو بڑی دلچسپ باتیں کرتے ہیں۔“ تابندہ بولی ”یہ بتائے آپ نے کون کون سے انسان پڑھے ہیں؟“

(چھروہی مالن)

میرے جواب کا انتشار کیے بغیر اس نے پوچھا "مثلاً کیا ہمارے اس بگلہ نمبر 3 والے پڑوسیوں کو پڑھا ہے آپ نے؟" پھر وہ یوں تفہیم کر رہی تھی اگر میں بھی نہ ہستا تو بد تہذیب سب خہرتا اس لیے میں بھی ہٹنے لگا (کہیں شکفتہ ہماری باشم سن نہ رہی ہو!) تابندہ کچھ اس طرح بھی تھی کہ مجھے کہنا پڑا "عجیب لگی لوگ ہیں۔"

"لگی؟" وہ بولی "حق کہنے۔ اسی شکفتہ کو دیکھئے۔ پانچ لاکھ کے بیتلے میں رہتی ہے اور پڑھتی اردو ہے۔"

تابندہ اب کے پھر زور سے بھی۔ ظاہر ہے کہ میں بھی اب کے پھر زور سے ہنسا اور بولا "بیتلے کے لان میں گاہ اور گیندے کی جگہ کدو اور کریلے اگار کھے ہیں!"

اس دفعہ تو تابندہ یوں بھی کہا کہ اس کا سارا خون اس کے چہرے میں جمع ہو گیا۔ آنکھیں ڈبڈ بائی آئیں اور یہ ڈبڈ بائی ہوئی آنکھیں پھیلیں اور مجھے نگل گئیں۔ ان آنکھوں پر دنیا کے ساتوں سمندر قربان۔ (مالن کی آنکھوں سے کتنی بھی تھیں یہ آنکھیں؛ مگر وہ ذرا زیادہ کالی تھیں۔ کیا تاروں سے چکلتی ہوئی اندر ہری راتوں میں آپ نے سمندری سفر کیا ہے؟")

"افواہ!" اس نے بھی پر بسط کرتے ہوئے کہا۔ "عجیب بے معنی لوگ ہیں تو بہ۔" پھر وہ ایک ننھے سے رومال سے آنکھیں پوچھ کر بولی "معاف کیجیے گا، آپ ہمارے یہاں پہلی دفعہ آئے ہیں مگر میں یوں بتیں کر رہی ہوں جیسے آپ کو برسوں سے جانتی ہوں۔ ویسے میں آپ کو برسوں سے جانتی ہوں۔ ہزار بار آپ کی آواز سنی ہے۔ ہزار بار آپ کی کارکی آواز سنی ہے۔ رکی تعارف نہیں تھا ورنہ کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ کتاب اٹھاؤں اور آپ کے لان میں جائیں گے۔ بڑا خوبصورت لان ہے۔"

(ہیوقوف تھے دونوں۔ مالی اور مالن)

"تو چلے۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے آپ مجھے کشیر لیے جا رہے ہیں۔"

آئیے۔" میں نے دروازے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

وہ دو قدم چل کر بولی "آپ نے یہ بتایا نہیں کہ آج آپ یہاں کیسے بھول پڑے۔"

میں نے فوراً کہا (نہ جانے میں نے بغیر سوچ بات کیسے گھر لی) "کل کسی ملازم نے بتایا کہ خان بہادر کی طبیعت ناساز ہے۔ میں نے سوچا تعارف تو نہیں ہے مگر پڑوہی کی حیثیت میں ان کا مجھ پر اور میرا ان پر حق ہے۔ اس لیے ان کے مزانج پوچھنے چلا آیا۔"

"بالکل خیریت سے ہیں۔" تابندہ بولی "اپنے حساب کتاب میں لگے ہوئے ہیں۔"

خدا کا شکر ہے۔" میں نے کہا۔ غلط جگہ کہا مگر کہ دیا۔ دراصل ہم دونوں تیزی میں تھے۔

وہ میرے ساتھ میرے بغلہ میں آگئی۔ اس نے لان کی طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ وہ سیدھی میرے کمرے میں چلی آئی۔

وہ سیدھی میرے کمرے میں چلی آتی ہے۔ مجھے کان سے پکڑ کر اٹھاتی ہے اور اپنی کار میں بٹھا کر ہوا ہو جاتی ہے۔ یہ کار جہاں سے گزرتی ہے، عطر حنا کی لکیریں کھینچتی چلی جاتی ہے۔ تابندہ کی آنکھیں ہر وقت ڈبڈبائی رہتی ہیں۔ میں وجہ پوچھتا ہوں تو وہ کہتی ہے کہ ”آنکھوں کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ صحراء اللہ زار اور سمندر۔ صحراء پیاس اسما رتے ہیں۔ لالہ زار سلاتے ہیں اور سمندر ڈبوتے ہیں“ میں کہتا ہوں۔ ”تو لا وہ مجھے ان سمندروں میں ڈوب جانے دو۔“ وہ میری طرف یوں دیکھنے لگتی ہے جیسے میں نے اس کی آنکھیں پیسے دے کر خریدی ہیں۔ اور یقین سمجھتے کہ جب وہ میری طرف دیکھتی ہے تو میں ڈوب جاتا ہوں۔ پھر کیا یک کسی حادثے سے بچنے کے لیے وہ بریکسٹ لگاتی ہے۔ پہلے بلباٹھتے ہیں اور وہ ہنسنے ہستے اپنا براحال بناتی ہے۔ یوں یہ آنکھیں اور ڈبڈبائی ہیں اور یہ سمندر اور گہرے ہو جاتے ہیں۔ وہ نفیات کا ایم۔ اے پاس کر لینے کے باوجود نفیات کے معاملے میں بالکل جاہل ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ جہالت میری نظر میں اس کا بھولپن بن جاتی ہے۔ جب وہ کہتی ہے کہ تم عمر بھر صرف میرے رہو گے نا؟ اور میں وحدہ کرتا ہوں کہ عمر بھرا ہی کار ہوں گا تو وہ مجھ سے یوں بے قراری سے لپٹ جاتی ہے جیسے عمر بھرا ہی کار ہوں گا۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ بغلہ نمبر 3 اور بغلہ نمبر 2 میں فلاں فلاں لوگ لبٹتے ہیں۔ ضمناً شگفتہ اور تابندہ کا بھی ذکر آگیا اور آنا چاہیے تھا کیونکہ شگفتہ کو میں صبح کے بعد اپنی کار میں گھما تا لاتا ہوں تو تابندہ شام سے پہلے مجھے اپنی کار میں گھما لاتی ہے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ نہ شگفتہ کو میری شاموں کا پتہ ہے نہ تابندہ کو میری صحبوں کا۔ مجھے ان دونوں کی یہ مخصوصیت بڑی پیاری لگتی ہے (یہاں ایسا محسوس ہوا ہے جیسے مالن کے ہاتھوں سے پھول گرپڑے ہیں)۔

آج صبح جب میں شگفتہ کو دو گھنٹے تک ویران سڑکوں پر گھمانے کے بعد کار کو گیراج میں چھوڑ کر اپنے کمرے میں آیا اور سگریٹ سلاگانا چاہا (لائسٹر مجھے دوسرے روز ہی مل گیا تھا) تو ”عصرِ امن فضلِ ربی“ کے پورچ میں ایک کار آ کر رکی۔ میں نے دروازے میں آ کر گلبری میں سے جھانکا تو یہ بغلہ نمبر 4 کا سجاد تھا۔ میرے جسم کا سارا خون سر میں جمع ہو گیا۔ میں پلٹ کر میز کی طرف بڑھا کہ میز کے دراز میں سے اپنا رویوال نکالوں۔ (میرے پاس جرمی میک کا ایک فرشت کلاس رویوال ہے) تو اتنے میں سجاد خادم کے ذریعے اطلاع بھجو نے کا تکلف کیے بغیر اندر آگیا اور پھر مجھ سے لپٹ گیا۔ پہلے تو مجھے شبہ ہوا کہ وہ بڑی نیت سے آیا ہے اور مجھے کسی نہ کسی طرح میز کے دراز تک پہنچنا چاہیے۔ اس لیے میں نے جسم کو جھکلے دے کر آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر اس نے مجھے بازوؤں میں جکڑ لیا تھا۔ پھر یولا ”میری جان!“ مجھے معاف کرو۔ میں تم سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ میں دو برس تک تمہارا انتظار کرتا رہا کہ تم اپنی زیادتی پر شرمند ہو گے مگر پھر سوچا کہ پہلے میں اپنی زیادتی پر شرمند ہو لوں۔ ویسے پیارے! تمہاری کار کا مڈگار ڈوکوئی دوسری کار بھی اوہیز سکتی تھی مگر مجھے گالی صرف تم دے سکتے تھے۔ ہے

ت؟” پھر اس نے میرا ماتھا اور میرے گال اور میری گردون چوم لی۔

آدھے گھنٹے کے اندر ہماری حالت ایسی ہو گئی جیسے ہم کبھی خفاہی نہیں ہوئے تھے۔ وہ سکی منگائی (جی ہاں بس دن رات میں دو تین بار یہ شوق کر لیتا ہوں) ایک دوسرے کی پیٹھ اور رانوں پر تھپڑا مار کر ہم نے دو برس کی ساری دھول جھاڑ لی۔

”میں آج کل بہت خوش ہوں۔“ سجاد بولا۔ ”بس صرف تمہاری دوستی کی کوئی تھی جو آج مجھے واپس مل گئی۔ اب تو میں بہت ہی خوش ہیں۔“ میں نے کہا ”کیوں؟ کیا کار و بارز و روں پر ہے؟“

”کار و بار تو ہمیشہ زوروں پر رہا ہے خدا کے فضل سے۔“ سجاد ایک نیا پیگ بھرتے ہوئے بولا۔ البتہ زندگی میں کچھ کیاں تھیں۔ ایک تمہارے جیسے دوست کی کمی اور ایک وہ کمی جس پر شاعر لوگ عمر بھر شعر کہتے کہتے مر جاتے ہیں۔“ ”عشق کر رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

بولा۔ ”ہاں۔ عشق کر رہا ہوں اور بڑے مزے کا عشق کر رہا ہوں۔ ابھی ابھی تمہاری پڑوسن تابندہ کو دو گھنٹے کی ڈرامیوں کے بعد کار سے اتارا ہے۔“

وہ رک گیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ نہ جانے کیوں دیکھنے لگا۔ پھر جب میں نے کہا کہ ”جبھی عطر حنا کی لپٹیں آرہی ہیں،“ تو وہ ہنسنے لگا اور بولا۔ روز کا پروگرام یہ ہے کہ صبح کے بعد دو گھنٹے تمہاری پڑوسن تابندہ کے ساتھ گزرتے ہیں اور شام سے پہلے کے دو گھنٹے اپنی پڑوسن مخالفتے مجھے اپنی کار میں لے جاتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ نہ مخالفت کو میری صحبوں کو پہتہ ہے نہ تابندہ کو میری شاموں کا۔“ وہ میری ران پر ہاتھ مار کر اوپنچا اونچا ہنسنے لگا۔

میں نے کہا بڑے اوہ ہو۔ ایک وقت میں دو عشق کر رہے ہو۔“

ہنسی پر قابو پاتے ہوئے اس نے پوچھا ”ساد۔ آج کل تم کیا کر رہے ہو؟“

میں نے کہا ”یار وہ میری ایک پرانا مالی تھانا خوشیا اس کی تلاش میں ہوں۔ اس کے بغیر لان تباہ ہو گیا ہے۔“

سجاد نے قہقہہ مارا ”تم وہی بور کے بور ہی رہے۔“ پھر یہاں ایک سنجیدہ ہو کر بولا۔ ”بھی خدا کے لیے بتانا کسی کو نہیں۔“

میں نے کہا ”لا حول ولا قوۃ..... مجھے کیا ضرورت پڑی ہے۔“



# اصول کی بات

”سو وہ تم ہو۔“ زمیندار نے عبد اللہ کو سر سے پاؤں تک اور پھر پاؤں سے سر تک دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی۔“ عبد اللہ نے خاکساری کے وہ تمام تاثرات چہرے پر بکھیر لیے جن کے بوتے پر اس نے اب تک اپنی جان سے ہاتھ نہیں دھوئے تھے۔

”پرم تو بوز ہے ہو۔“ زمیندار نے جیسے اس پر تھوک دیا۔

عبد اللہ ذرا دیر کے لیے بھجو گیا۔ پھر فوراً اپنی سک کر پہنچا۔

”میری عمر تو سر کار بھی کوئی پانچ کم پچاس ہو گی۔“

پانچ اور پچاس تو نہیں؟“ زمیندار نے مسکرا کر بھری ہوئی جو پال پر نظر دوڑا۔ ”اوپر نیچے کا دھوکا تو ہی ہو جاتا ہے۔“

لوگ زور زور سے ہنسنے لگے اور زمیندار پیچوان کی ”نے“ کو ایک موچھ پر بکھیرتا رہا۔ قہقہے کے تو اس نے عبد اللہ سے پوچھا۔

”جب تم پیدا ہوئے تھے تو ملکہ و کنور یہ کاراج تھا؟“

عبد اللہ لوگوں کو ایک بار پھر ہنسنے کو موقع دینا چاہتا تھا، اس لیے فوراً بولا۔

”جی یہ تو یاد نہیں پر اتنا یاد ہے کہ ان دونوں ملکے کا روپیہ چلتا تھا۔“

”او سنو“ زمیندار نے سب سے جیسے داد طلب کی۔ ”ملکہ کا روپیہ تو ابھی کل تک چل رہا تھا۔“ یکا یک زمیندار کو جیسے کوئی بات یاد آگئی اور وہ رقت سے بولا ”ہا! کیا روپیہ تھا۔ پچھی چاندی تھی۔ یوں مکھلتا تھا جیسے کنوری نیچ رہی ہو۔ ہا! کیسے زمانے تھے جولد گئے۔ مجھے یاد ہے، خدا بخشے بابا نے خوش ہو کر بھی کسی مزارع کو ایک روپیہ دیا تو اس نے ان کی جوتیاں اٹھا کر چوم لیں اور آج کسی کو وس روپے بھی دے دو تو وہ دس روپوں کی طرف نہیں دیکھتا۔ دینے والے کے ہاتھ کی طرف دیکھتا کہ شاید وہ دس روپے اور نکالے۔“

لوگ جو پہلے محفوظ ہو رہے تھے، بھیندہ ہو گئے۔ پر لے کونے سے ایک آدمی بولا۔ ”اس زمانے میں تو سر کار ایک روپے سے لمحے کی چادر بن جاتی تھی۔ آج دس روپوں میں کھدر کی چادر بھی نہیں بنتی۔“

زمیندار نے پیچوان کی ”نے“ کو پلٹک کی پٹی پر نیچ دیا۔ ”تو کیا میں نے تم سے لمحے اور کھدر کا بھاوا پوچھا تھا؟ کیا کبھی تمہارے باپ نے بھی لمحے کی چادر باندھی ہے؟“

سنا تا چھا گیا۔ اس سنائے میں سوائے عبد اللہ کے کوئی شخص زمیندار کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ سب اپنی جو تیوں کی نوکوں یا تہدوں کو درست کرنے لگے تھے۔ پھر جب اس سنائے کو زمیندار کے چیزوں کی گزگڑا ہٹ نے تو ڈا تو سب نے ایک ساتھ زمیندار کی طرف دیکھا۔

اور زمیندار نے جیسے سب سے پوچھا۔ ”ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا؟“

کوئی آہتہ سے بولا۔ ”ملکہ والے روپے کی بات ہو رہی تھی۔“

”ہا! زمانے جو لد گئے۔“ زمیندار نے ایک آہ بھری اور خاموش ہو گیا۔ ذرا دیر کے بعد پہلو بدال کر بولا۔ ”کیوں بھی سنائے وہ کرے کی شادی پر تھلوں سے جو میراثی آئے ہیں وہ بلا کے شہنماں نواز ہیں۔ ذرا انہیں بلا و چوپاں پر۔ ایک چوکی ہو جائے۔“

ایک نوجوان بولا۔ ”جی ان کے ساتھ تو بڑے اچھے گانے والے بھی ہیں۔“

ان سے کہہ دو۔“ زمیندار نے حکم دیا۔ ”شام کی نماز کے بعد ہم اکتارے بلھے شاہ کی کافیاں نیں گے، گلے دھو کر آئیں۔“

”جی اچھا۔“ کٹھی بہت سی آوازیں آئیں۔

زمیندار بولا۔ ”تم لوگوں نے سنا ہو گا یہ کہ ماہلے مجرما کرنے کی سوچ رہا تھا اور ملتان جا کر قدر و تجربی سے بات بھی کر آیا تھا۔“

”جی۔“ کس نے تائید کی۔

”میں نے اسے کہلوا بھیجا تھا کہ اگر مجرما کرنا ہے تو پہلے چوپاں پر آ جاؤ تاکہ یہاں میں تمہاری چیزی اتار کر رکھ لوں اور باقی کو مجرما کرنے بھیج دوں۔“

سارے گاؤں کی پلید کرنے چلا تھا کمبوخت۔ ہم نے لڑکے کا بیاہ کیا تو صاحب ضلع کو بلوایا۔ کرم بیاہ کرے تو قدر و تجربی کو بلوائے! حرامزدہ۔“

لوگ دو دو تین تین کی ٹولیوں میں آہتہ آہتہ باتیں کرنے لگے۔ زمیندار ان کی باتیں سن نہیں رہا تھا مگر سمجھ ضرور رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اسی کی نیکی اور پرہیز گاری کی باتیں کر رہے ہیں۔ خود آسودگی کے جذبے سے اس نے رخ بدلا اور سامنے دیکھا۔ عبد اللہ جہاں کچھ دیر پہلے آ کر رکا تھا، وہیں جما کھڑا رہا اور اس کے ہاتھ جو زمیندار کے پہلے سوال کا جواب دیتے ہوئے جڑ گئے تھے۔ اب تک جڑے ہوئے تھے۔ البتہ اب ذرا سا ڈھیلے ہو گئے تھے اور اس کے انگوٹھے کے ناخن پر ایک کمکھی ساکت و صامت بیٹھی تھی۔

”تم اب نہیں کھڑے ہو؟“ زمیندار نے پوچھا۔ جیسے وہ کچھ دیر کے لیے سو گیا تھا۔ عبد اللہ نے جواب میں جڑے ہوئے ڈھیلے ہاتھوں کی پھر سے اکڑا لیا۔

”اولاد ہے؟“ زمیندار نے پوچھا۔

”جی! ایک بینی ہے۔ ایک بینا بھی تھا بے چارہ خدا نے لے لیا۔“

”کیسے مر؟“

”جی! دق سے۔“

”تو پھر تمہیں بھی دق ہوگی۔“ زمیندار نے جیسے اس کی منہ پر دوبارہ تحکم دیا۔ عبداللہ اپنی آنکھوں میں ریت ڈالے چپ چاپ کھڑا رہا جیسے مرض کی تشخیص اس کی سمجھی میں نہیں آئی۔

زمیندار نے جیسے آخری فیصلہ ننانے سے پہلے پوچھا۔ ”نام کیا ہے تمہارا؟“

”عبداللہ۔“ وہ بولا۔

”تو پھر دلا کہو۔ پورا نام کس نے پوچھا تھا؟“

عبداللہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

”دیکھو بھائی دلے۔ میں زمینوں کو جتو اتنا نہیں ہوں۔ میں تو انہیں کو لھو میں پلواتا ہوں اور یہ کو لھو چلانے کے لیے مجھے بڑے بڑے مضبوط بیلوں جیسے کسان چاہئیں۔“ لوگوں کی نہیں نے زمیندار کی بات کاٹ دی۔ وہ خود بھی ذرا سما سکرا یا۔ پھر بولا ”اور تم بدھے آدمی ہو۔ بال کچھڑی ہو رہے ہیں۔ ہاتھ کا نپ رہے ہیں۔ تم کیا مل چلاو گے؟ اور پھر فرض کیا تم نے ہی چلا یا۔ پر تم اکیلے آدمی ہو۔ یہاں پڑو گے تو کھیتوں کی رکھوائی کوں کرے گا؟ بینی تو اپنے گھر چلی جائے گی۔ بیوی ہے؟۔“

”جی ہے۔“

”چلو یہ تو اچھا ہے۔ بیوی تو ہے۔ بیوی ہونی چاہیے۔ مل چلاتی نہیں پر چلواتی تو ہے۔“ لوگ پھر بنے۔

تو یوں کہو کہ تم کل تین ٹنگ ہو۔“ زمیندار بولا اڑکا ہوتا تو شاید تمہارا کام بن جاتا۔ اور ہاں تم نکالے کیوں گئے پہلی زمینوں سے؟“

”بس اتنی بات ہوئی سرکار۔“ عبداللہ نے جڑے ہوئے باٹھوں میں سے ایک ہاتھ کے انگوٹھے کو انگلیوں کی پوروں تک لا کر کہا۔ ”میں نے کہا چنانہ مہنگا جا رہا ہے۔ بو لے نکل جاؤ۔“

”نکالا تو ٹھیک نکالا۔“ زمیندار نے بھوں اچکائی۔ ”اب اگر میں ملکہ کے روپوں کی بات کروں اور کوئی لمحے کھدر کے بھاؤ لے بیٹھے تو بتاؤ میں اس کے ساتھ کیا کروں، بیجی کروں گا اور کیا کروں گا۔“

سب نے ایک بار پلٹ کر پر لے کونے کی طرف دیکھا جہاں ایک آدمی بوكھلا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

پہلو بدل کر زمیندار نے سامنے اصلبل کی طرف دیکھا جس میں مشکلی کیت اور سفید رنگ کے تین گھوڑے تو بڑوں میں منہ ڈالے

کھڑے تھے۔ ”کیوں بھی؟ اب صحیح ہے نا؟“ اس نے سارے مجھ سے پوچھا۔ ”تحانیدار کے گھوڑے کی ادھر بھینسوں کے پاس بندھوادیا ہے۔ تمہی میں سے کسی نے کہا تھا کہ ایک پچھلی سارے تالاب کو گنہ کر دیتی ہے۔“

”کوئی بولا؟“ اچھا خاصا ہے تحانیدار کا گھوڑا پر ان گھوڑوں کے سامنے تو گدھا سالنے لگتا ہے۔“

قہقہوں کے ایک دور کے بعد زمیندار گھوڑوں، تحانیداروں اور روئی کے زخوں کی باتیں کرنے لگا اور کچھ دیر کے بعد زری سے تھے ہوئے جوتے بڑی بے پرواںی سے گھینٹا چوپاں سے اتر گیا۔ لوگ ایک دوسرے کے پاس کھلک آئے اور حقہ گزگزانے لگے اور عبداللہ اکیلا رہ گیا۔

وہ بہت اداں تھا۔ پہلے زمیندار نے اسے صرف اس لیے جواب دیا تھا کہ ”آج کل چنا تو بہت اونچا جا رہا ہے سرکار۔“ اس نے یونہی رواروی میں یہ بات کہہ دی تھی جیسے کوئی موسم کی خرابی کی بات کہہ دے۔ مگر زمیندار نے اس کا کچھ اور مطلب لیا۔ ”یہ چنا؟ یہی چنا جو ہمارے گھوڑے کھار ہے ہیں؟“

”جی سرکار۔“ عبداللہ نے کہا تھا۔

اور زمیندار نے پوچھا تھا ”خوب سوچ کر بتاؤ۔ بہت مہنگا جا رہا ہے نا؟“

”جی ہاں بہت بھی مہنگا۔“ عبداللہ نے پھر کہا تھا۔

اور زمیندار نے چاک بارتے ہوئے کہا تھا ”نکل جاؤ یہاں سے نمک حرام کہیں کے۔ کتنے برسوں سے تم ہمارا دانہ کھار ہے ہو۔ آج ہمارے گھوڑے نے تمہارا دانہ کھایا تو دانے کے نرخ یاد آگئے؟“

اور عبداللہ اس گھروندے سے نکل ایا تھا جس میں اس نے گیارہ برس گزارے تھے اور جب اسے لائل پور گئے ہوئے ہیں کی چھٹی ملتی تھی کہ مزدوری کر کے اپنے علاج کے لیے روپیہ کمالیتا ہوں اور آپ لوگ زیادہ فکر نہ کریں تو وہ اسی گھروندے کے آنکھیں میں ٹھنڈھیوں کا دیکھا پکاتا تھا اور چڑیوں اپنی بیٹی ماکھاں کے لیے جھولے ڈالے تھے۔ اور جب وہ مل چلاتا تھا اور اس کی بیوی اسے روٹی اور چھا چچہ پہنچانے آتی تھی تو کھاں جھولا جھولتی اور گاتی تھی:

ڈاچیاں کچاوے

ویرخیری آوے

با با میراں کی چیوے

اماں میری تی جیوے

ویریاد آوے

ڈاچیاں کچاوے

ویرخیری آوے

اس وقت عبد اللہ کا جی چاہا کہ اونچے سروں میں ”ڈاچیاں کچاوے“ گانے لگے اور ساتھ ساتھ رونے لگے اور جب لوگ اس سے وجہ پوچھیں تو انہیں بتائے کہ ”میں نے عمر بھرا پنے ہاتھ کی حلال روزی کھائی ہے، پر کل میں نے ایک گاؤں کی مسجد میں جا کر نماز کے بعد بھیک مانگی تھی۔ اور جب میں بھیکماناںگ رہا تھا تو میری آنکھوں میں آنسو جلنے لگے تھے۔ پھر جب میں چار روٹیاں اور چار آنے لے کر بیوی میں کے پاس آیا تھا بیوی نے کہا تھا:

”کانپ کیوں رہے ہو؟ آج تم نے آنسو بیج کر روٹی لیتے تھے۔ جھگڑا تو روٹی ہے کاہے ماکھاں کے بابا! امام صاحب کو بھی آج اس مسجد میں روٹی نہ ملے تو کل کوئی دوسرا مسجد ڈھونڈیں۔ اللہ اللہ کرو۔ وہ جب ترس کھائے گا تو بدله چکا دیں گے۔ چار روٹیاں لائے ہو۔ آٹھا پنے ہاتھ سے پکا کر اور گھنی لگا کر فقیروں کو نکھلاوں تو ڈائن ہو کر مردوں۔“

اور میں نے بیوی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا جیسے وہ بولی تو میں مر جاؤں گا۔

عبد اللہ اچانک اٹھا اور چوپال کے پچھواڑے کی طرف پکا جہاں ایک کیکر کے نیچے وہ بیگاں اور ماکھاں کو بٹھا آیا تھا۔ اس نے دور ہی سے دیکھ لیا کہ وہ کیکر کے نیچے موجود نہیں ہیں۔ ذرا سامنہ کا مگر پھر کیکر کے نیچے جا پہنچا اور اس کے تنے پر ہاتھ رکھ کر اوہرہ دیکھنے لگا۔ اچانک آشیانوں کی طرف جاتی ہوئی چڑیوں کا ایک بہت غول کیکر پر اترتا اور اس کی ہر شاخ پر گیندیں سی لٹک گئیں۔ عبد اللہ کو پہلی بار چڑیوں کا شور بہت برا لگا۔ اس نے پیچھے فضا میں اچھل کر غائب ہو گئیں۔ چڑیوں کے پروں کی جھپٹت میں آئے ہوئے کیکر کے پھولوں نے زمین پر ہلہی سی بکھیر دی تھی اور آسمان پر ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں ایک گھنی بدلتی سے تیروں کی طرح نکلی پڑ رہی تھیں۔

عبد اللہ چوپال کی طرف پٹا تو سامنے سے اسے بیگاں آتی نظر آئی۔ اگر کلی میں سے ایک پہناری نہ گزر رہی ہوتی تو وہ بیگاں کے پاس بھاگ کر پہنچ جاتا۔ پھر بھی وہ بناہر تیز نہ چلتے ہوئے تیزی سے بیگاں کے پاس پہنچا مگر اس کے کچھ کہنے سے پہلے بیگاں ہی بولنے لگی۔ ”اوہرہ ڈیور ہی میں ایک زنانہ کسان خانہ ہے۔ ہم اس میں چلی گئی ہیں۔ سب تو کرانیاں بھی وہیں سوتی ہیں۔ بڑے اچھے لوگ ہیں۔ وہی ہمیں وہاں لے گئیں۔ پھر ہمیں چینی کی چائے پلائی۔ بھرا پنے وکھوں دردوں کی باتیں بھی ہو گئیں۔ اس وقت ماکھاں ان کے ساتھ چائے کے برتن دھور رہی ہے۔ میں نے کہا میں تمہاری خبر لے آؤں۔ تمہیں چائے ملی؟“

”مجھے تو ابھی حق بھی نہیں ملا۔“ عبد اللہ نے کہا۔ ”پر تمہاری بات سن کر سمجھو پی لی۔ ویسے بیگاں! کام جتنا نظر نہیں آتا۔ زمیندار کے مثی کا

پتہ لگاتا ہوں۔ وہ ملے تو اس کے پاؤں پکڑاں۔ تم بھی کسی تو کرانی سے زمیندارن کو کہلواؤ۔ کوسوں تک پھیلی ہوئی زمینیں ہیں۔ ایک آدھ بیجھے ہمیں مل جائے تو کیا بگڑ جائے گا ان بادشاہوں کا۔“

بیگان وعدہ کر کے چلی گئی اور عبد اللہ چوپال پر آگیا۔ لوگ اٹھ گئے تھے۔ صرف ایک سائیس بیٹھا تھا گزگزارہ تھا۔ عبد اللہ سید حاس کے پاس جا بیٹھا۔ سائیس نے حصہ اس کی طرف گھما دیا اور جب عبد اللہ چند کش لگا چکا تو سائیس بولا ”برازمان آنگا ہے چاچا۔ پیٹ کے لیے کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں۔ اب تم کپی عمر کے آدمی ہو۔ یہ تمہارے آرام سے کھولے پر بیٹھ کر حصہ پینے کے دن تر تھے۔ مگر مٹھوکریں کھاتے پھر رہے ہو در بدر کی۔ خدا اگر آدمی کا پیٹ نہ لگاتا تو کوئی مٹھا ہی نہ ہوتا۔ ذرا یہ پھاواڑا لے کر گھوڑوں کی لید تو سیست لو۔ میں جا کر گودام سے تمہارے لیے کھٹیاں نکال لاؤں۔“

عبد اللہ چپکے سے پھاواڑا اٹھا کر اصلب کی طرف چلا گیا۔ ارو سائیس چوپال سے اتر گیا۔ شام کے بعد ایک آدمی عبد اللہ کے لیے کھانا لے آیا۔ ذرا دیر بعد چوپال پر گاؤں والوں کا ریلاسا آگیا۔ اکٹھی چارائج لاٹنیں جلنے لگیں۔ مراثی بھی آگے اور ڈھولوں، شہنائیوں کو سر کرنے لگے۔ پھر جب زمیندار نے چوپال پر قدم رکھا تو بالکل وہ کیفیت چھا گئی جب سینما والوں میں فلم شروع ہونے سے پہلے بتیاں گل کر دی جاتی ہیں۔ پہلے شہنائی والے نے اپنے کمال دکھایا۔ پھر گانے والے نے بلھے کی کافیاں اور علی حیدر کے دو ہے نائے۔

آخر زمیندار نے دس روپے کا ایک نوٹ ایک ہاتھ میں اور دوسرانوٹ دوسرے ہاتھ میں پکڑ کر دونوں ہاتھ بلند کر دیے۔ شہنائی والا آگے بڑھا اور ایک نوٹ لے کر سلام کرتا ہوا لئے قدموں واپس چلا گیا۔ گانے والوں میں سے بھی ایک نے یہی کیا۔ پھر سائیس نے آگے بڑھ کر فرش پر چادر بچھا دی اور ایک دونی رکھ دی۔ ہر شخص جیب میں ہاتھ ڈالے یا ٹیک کھولے آگے بڑھا اور سب نے ایک ایک دونی چادر پر رکھ دی۔ عبد اللہ کے لیے یہ سب باتیں نئی تھیں۔ مگر دوسروں کی دیکھا دیکھی اٹھا اور مسجد سے بھیک میں ملی چونی ٹیک سے کھول کر اور آگے بڑھ کر زمیندار کے قدموں میں چادر پر ڈال دی اور ابھی وہ ایک دونی اٹھا لینے کی سوچ رہا تھا کہ زمیندار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”اچھا تو تم دلے ہو۔“ پھر وہ لوگوں سے مخاطب ہوا۔

”بھتی لوگوں کیہے اوس بڑھے کو۔ تم سب نے ایک ایک دونی دی ہے اور اس نے یہ میرا سامنے چونی لو کر رکھ دی ہے۔ یہ فرق ہے پرانے اور نئے زمانے میں۔ اسے کہتے ہیں وضعداری کے روزگار ہے نہیں۔ زمینوں کی تلاش میں بھکتا پھرتا ہے۔ ابھی میرے مزارعوں میں شامل نہیں ہوا مگر اصول کی بات اصول کی بات ہے اور اس نے چونی کھول کر رکھ دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں کبھی کبھی پرانے لوگوں کو بہت پسند کرنے لگتا ہوں۔ نوجوان مزارعوں کو تو اتنا بھی پتہ نہیں ہوتا کہ زمیندار کی جو تی سیدھی کیسے کی جاتی ہے۔ جاؤ بھتی دلے بیٹھ جاؤ۔ کھانا و اناں مل گیا نہیں؟“

”مل گیا سرکار“ وہ مارے خوشی کے کانپ رہا تھا۔ ”آپ کے پنج جنیں، آپ کی زمینیں بچلیں۔“ دو نیوں کو گناہ گیا اور انہیں برادر تقسیم کر کے شہنشاہی بجا نے والے اور گویوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

اور جب محفل برخاست ہو گئی اور چوپال میں صرف ایک دیا جلتا رہ گیا تو عبد اللہ اٹھ کر اپنے کھنولے پر آبیٹھا۔ چوپال کے سمجھن کے پرے کونے پر چار کھائیں بچھی ہوئی تھیں اور چاروں آدمی بار بار حقہ پر رہے تھے اور کھانس رہے تھے۔ عبد اللہ کا جی چاہا کہ وہ ان کے پاس جا کر باتیں کرے مگر اتنے میں سائیمس آجی۔ وہ اس کی پامنی بیٹھ گیا اور بولا۔ ”تمہاری بات تو کچھ ملتی ہوئی معلوم ہوتی ہے چاچا۔ تمہاری چوپنی کام کر گئی۔ ایسی باتوں کا بڑا خیال رکھتے ہیں سرکار۔ میں نے ابھی ابھی سنائے کہ وہ جس آدمی نے لٹھے اور خدر کی بات کی تھی تاً اسے سرکار نے نکال دیا ہے۔ یوں سرکار کی خاص شکارگاہ والی زمینیں تمہیں ملنے والی ہیں۔ ایک تو ویسے ہی یہ زمینیں سونا گئی ہیں، دوسرے مہینے میں دوبار نہیں تو ایک بار تو سرکار ضرور وہاں جاتے ہیں۔ چھوٹی سی بندگی بنی ہوئی ہے، وہاں پھرستے ہیں اور شکار کھیلتے ہیں۔ تمہیں یہ زمینیں مل جائیں تو بھجوتہ مارے ولد ردور ہو گئے۔ پرانے مزارعوں نے ساکر بندگی کا علاقوہ تمہیں مل رہا ہے تو وہ اب چوکی کے بعد سرکار کے پیچھے پڑ گئے کہ ہم پرانے خدمت گار ہیں اور ان زمینوں پر ہمارا حق زیادہ ہے۔ مگر سرکار نے ڈیوڑھی کے اندر جاتے ہوئے بڑے مزے کی بات کی۔ کہنے لگے۔ ”شاید میں پہلے کچھ سوچتا مگر اب تو اصول کی بات ہے۔ تمہیں جلانے کے لیے اب تو یہ زمینیں دلے ہی کو دوں گا۔“

”میں مخالف نہیں چھوڑوں گا چاچا۔“

عبد اللہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سائیمس کا شکر کیس طرح ادا کرے۔ اچانک سائیمس اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ”نہیں چھوڑوں گا مخالفی۔“ اور پھر چلا گیا۔

اور عبد اللہ نے کھنولے پر لیٹتے ہوئے اتنی لمبی انگڑائی لی کہ اس کے تمام جوڑوں میں سے پانچ چھوٹے گے۔ پھر اس نے کچھ پڑھ کر اپنے چاروں طرف چھوڑ کی، چوپلے کا ایک بہن کھول کر اپنے سینے پر چھوڑ کی اور چادر اوڑھ کر سو گیا۔

ذرا سو یا تھا کہ کسی نے اسے کندھے سے ہلا دیا۔ ”کون ہے؟“ اس نے پوچھا۔

وہ سائیمس تھا۔ پامنی کی طرف بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”دیکھو چاچا! بڑا ضروری کام ہے اس لیے تمہیں جگا دیا۔ وہ بندگی والی زمین سرکار نے تمہارے نام کر دی تھی تا۔“ مشی سے بھی کہہ دیا تھا اور یہ بھی انتظام کر دیا تھا کہ صبح کو تم بیلوں کی ایک جوڑی بھی پسند کرو۔ مگر اب معاملہ کچھ بگزیا ہے۔ تم سے کچھ ہو سکتا ہے تو کرو۔“

عبد اللہ نے چادر ایک طرف اتار کر کھدوی اور سائیمس کے قریب ہو کر بولا۔ ”کیا ہو گیا ہے ایک دم۔ تم بتاؤ تو کہی۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا کروں گا۔“

سائیکس آہستہ سے بولا، "تمہیں لے چلتا ہوں ڈیورٹمی میں۔ یوں کرو کہ تمہاری بیٹی ہے ناماکھاں اس کو سمجھادو۔"

"کیا سمجھادوں؟ ..... وہ کیا کرے گی؟" عبد اللہ نے پوچھا۔

اور سائیکس بولا۔ "ارے چاچا! اس کو سمجھادو تا۔ اس سے کہہ دو تا کہ مان جائے۔ آدھی رات ہونے کو آئی ہے اور وہ اب تک نہیں مانی ہے۔ نہ وہ مانتی ہے نہ اس کی ماں اسے مانتی ہے۔ اب تم بھی نہ منا سکو تو سر کار کہتے ہیں کہ اپنی راہ لو۔ اصول کی بات ہے۔"



# موج خوں

شادی کے تین دن بعد راحت علی کو یک محسوس ہوا کہ اس نے ساجدہ کو اپنی بیوی بنا کر جھک ماری ہے۔ یکا یک اس کے کابھی لمحہ بھر پہلے ساجدہ اس کے ذہن پر آسمان کی طرح چھائی ہوئی تھی۔

کچھ دیر پہلے جب گازی جہلم کے پل سے گزر رہی تھی تو ساجدہ نے رسالہ ایک طرف رکھ دیا تھا اور پل کی گرج کو ایک لمحہ کان وہر کر سننے کے بعد اس نے کہا تھا ”ارے! ایسا لگتا ہے کہ پل ”جہلم جہلم“ پکار رہا ہے۔ اس پر راحت علی نے کہا تھا ”تمہیں اپنے میکے جانے کا کتنا شوق ہے بجو۔ یہ بھیک ہے کہ ان دونوں میں بھی تمہارے میکے میں ہی رہوں گا“ پر ایسا لگتا ہے کہ تمہارے ماں پاپ دو تین دن کے لیے تمہیں مجھ سے چھیننے لے جا رہے ہیں۔ بچ کہتا ہوں بجو! میں نے ابھی بھی بھر کر تمہیں دیکھا ہی نہیں۔ تمہیں کیا پتہ کہ میرے ہاتھوں کی بڑیاں تمہارے کنگنوں کی چوٹیں کھانے کے لیے کتنی مدت سے بے قرار ہیں۔ مگر میں تمہارے انتظار میں اتنی مدت تک جا گئے رہنے کے بعد ابھی آنکھیں ہی مل رہا تھا کہ تمہارا بھائی تمہیں لینیا گی۔ بات سنو یوں کریں کہ جہلم میں اتریں ہی نہیں۔ پنڈی کی طرف بھاگ جائیں۔“

اس پر ساجدہ جس طرح مسکرائی تھی وہ ایک عجیب مسکراہٹ تھی۔ اس مسکراہٹ میں حیا بھی تھی، غور بھی تھا اور اس شکاری کی سی خود آسودگی بھی جوہر کو جاں میں پھنسا دیکھ کر اسے جاں میں سے نکالنے اور ذبح کرنے سے پہلے ناگلیں پھیلا کر بیٹھ جاتا ہے اور آنکھیں بند کر کے سگریٹ کے لبے لبے کش لگانے لگتا ہے۔ اس نے سرف اتنا کہا تھا۔

بھاگ تو جائیں پروہ پر لی طرف کھڑکی کے پاس بھائی جان جو بیٹھے ہیں۔“

Rahat Ulی نے چند مہینے پہلے جب ساجدہ کو چہلی بار دیکھا تھا تو اسے پہلے بار تین آیا تھا کہ اجتنا کہ غاروں جیسی دیویاں آج بھی زندہ ہیں۔ ایسا چمکتا چمکتا رنگ کر اسے دیکھنے کے بعد آدمی کچھ دیکھنے لے سکے۔ سب بھوؤں کے نیچے اتنی بڑی بڑی آنکھیں کہ بچوں کے چہروں پر بھی بڑی معلوم ہوں۔ اتنی بھی پلکیں کہ اگر قندہ اس کے سر پر چک رہا ہو تو پلکوں کے سامنے اس کے سارے چہرے پر چلنے کی کاڑھ دیں۔ پلی ذرا سی جھکی ہوئی ناک اور اتنے بار یک ہونٹ جیسے سرخ ریشم کے ایک تار پر سرخ ریشم کا ایک اور تار رکھا ہو۔ ننھی سی گول ٹھوڑی اور ایسی شفاف گردن کہ پانی کا گھونٹ بھی اترتا دکھائی دے جائے۔ اس کے جسم کی ساری قویں اور تمام زاویے ان دیویوں کے سے تھے۔ راحت علی نے جب بھی ان دیویوں کی تصویریں دیکھی تھیں تو صحت اور جوانی سے لباب بھرے ہوئے ان کے جسموں نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کیا تھا کہ ان مورتیوں کے خالقوں نے ذرا سماں لغہ ضرور کیا ہے۔ سنگ تراث، مصور اور شاعر سید گی سادی صاف نظر آنے

والی حقیقت میں فتنی حسن صرف یوں پیدا کر سکتے ہیں کہ چلتے چلتے یونہی جیسے روا روی ذرا سام بالغ بر تجاہیں۔ مگر ساجدہ کو دیکھ کر ایک پل کے لیے راحت علی کو خیال آیا تھا کہ کیا <sup>بھائی</sup> بھی خدا بھی مبالغہ کرتا ہے؟ پھر جب اس نے دیکھا تھا کہ یہ مورتی الحنفی بیٹھتی بہتی اور چہرے پر اترتی ہوئی انہوں کو بھکتی بھی ہے تو اس نے سوچا تھا کہ بعض حقیقتیں بھی مبالغہ کی حد تک حسین ہو سکتی ہیں۔

Rahat Ulی اپنے ایک دوست عبدالخان کو شہ بالا بن کر برات کے ساتھ لا ہور سے جہلم آیا تھا۔ رات کو جب دھن کی سہیلیاں عبدالخان کو کان سے پکڑ کر لے جانے لگیں تو ظاہر ہے کہ راحت علی شبہ بالا بھی دو لھا کے دفاع کے لیے ان کے ساتھ ہو لیا۔ لہن کی حوصلی کے صدر دروازے کے قریب اچانک ایک لڑکی تھیں اُنہیں: ”ہائے ہمارے ساتھ تو یہ کوئی غیر مردوں کی آرہا ہے۔“ سب لڑکیاں بلباکر دروازے کی طرف بھاگیں تو آگے جاتا ہوا عبدالخان ان کے ریلے میں گر پڑا۔ ایک لڑکی اس کے اوپر سے کوڈی اور پھر سب لڑکیاں اس پر سے پھاندی ہوئی گزر گئیں۔ راحت علی نے لپک کر عبدالخان کا اٹھایا تو سامنے سے لڑکیوں نے دو تارچوں کی روشنی ان کے چہروں پر چانٹوں کی طرح دے ماری اور پھر چیخ چیخ کر ہنسنے لگیں اور تالیاں بجاتی ہوئی اندر بھاگ گئیں۔ اور ڈیورڈی کی چھمٹ پر بھی بھل دیج گئی اور راحت علی نے عبدالخان کو مشورہ دیا کہ سنہری موقع ہے بھاگ نکلیں۔ عبدالخان لڑکیوں کی اس بد تہذیبی کی وجہ سے غصے میں تھا۔ کچھ کہے بغیر پلٹنا تو سامنے سے اس کے منہ پر ایک اور تارچ کا چانٹا پڑا اور دونوں دم بخود کھڑے رہ گئے۔ پھر ایک لڑکی یوں تھیخ کرنے لگی جیسے دو لہے اور شہ بالے کو تیل سمجھ کر اندر حوصلی میں بنا کر ہے۔ مجبور ہو کر دونوں حوصلی میں آئے تو وہاں تیز روشنی نے رات کو دن بنارکھا تھا۔ راحت علی نے پلٹ کر جب اس لڑکی کی طرف دیکھا جو دونوں کو اندر ہنگالائی تھی تو ایک دم اس کا جی چاہا کروہ ڈکرانے لگے۔ ”منہ چھاڑے کیا دیکھ رہے ہو؟“ لڑکی رعب سے بولی۔ آگے چلو۔“ راحت علی نے لڑکی کی آواز پہچان لی۔ بیسی تھی جس نے ایک مردوں کی موجودگی کا اندرہ مارا تھا اور شاید یہی جس نے منہ کے بل گرے ہوئے دو لھا پر سے پھاند نے کی ابتداء کی تھی۔ یہی ساجدہ تھی۔

عورتوں اور لڑکیوں سے ٹھنے ہوئے ایک کمرے میں جب عبدالخان اور راحت علی کے سامنے ”بیڑی گھوڑی“ لا کر کچھ گئی تھی تو ساجدہ آئی۔ ان کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ اور ”بیڑی گھوڑی“ میں جسے ہوئے ایک طشت میں سے میدے کے بھدے بھدے بت اٹھا کر دو لھا سے ان کا تعارف کرنے لگی: ”یہ آپ کے ابا جان ہیں۔ مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی تو نہ سے پہچانے۔ سانحہ ستر عورتوں کے قبیلے ایک ساتھ بلند ہوئے اور کسی نے کہا: ”یہ ساجدہ کم بخت تو شیطان کی خالہ نگلی“ ساجدہ دو لہا سے مخاطب تھی ”یہ آپ کی امی جان ہیں۔ دھیجوں کی طرح لگلی ہوئی جھریلوں سے پہچانے۔ یہ آپ کے ماموں جان ہیں۔ ہنچلی پر رکھی ہوئی بیہر ابرافیوں کی گولی سے پہچانے۔ اور یہ آپ کے شہ بالا جان ہیں۔ الوکی سی صورت سے پہچانے۔“

عورتیں یوں چلا چلا کر ہنس رہی تھیں جیسے روری ہوں اور ساجدہ آخری بت کو راحت علی کے اتنا قریب لے آئی جیسے اس کے منہ میں

خونس دے گی۔ بولی ”یہ آپ ہیں۔ وہی پکوڑا سی ناک ہے کہ نہیں؟ وہی پتھے برابر آنکھیں ہیں کہ نہیں؟ وہی غار سادہ ہے کہ نہیں؟“ پھر وہ عورتوں کے مجنونانہ تھیوں کے درمیان اس بست کو راحت علی کے سامنے نچانے لگی ”ہے کہ نہیں؟ ہے کہ نہیں؟“ اور راحت علی ہر کا بکا بظاہر اس بست کو دیکھتا رہا مگر دراصل وہ ساجدہ کو دیکھتا رہا وہ صدمیاتی وہندکوں سے نکل کر یہاں چلی آئی تھی اور اپنے ساتھ اتنا تابے پناہ اتنا تاباں برداشت اور قدموں تلے سے زمین کو نکال دینے والا حسن سمیت لائی تھی کہ حقیقت اور مبالغہ کی حدیں آپس میں غلط مطلط ہو گئی تھیں۔

راحت علی کو عبد الحمان پہلے سے بتا چکا تھا کہ دہن کی خاص سیکلی کی طرح برسوں کی پرانی رسم کے مطابق دوپہا کے شہ بالے کو بھی حق حاصل ہے کہ وہ ہر قسم کی آزادی برست سکتا ہے، بشرطیکہ بد اخلاقی کامرنکب نہ ہو۔ وہ میدے کے اس بست کو ساجدہ کے ہاتھ سے نوچ کرائے چرم کر سکتا ہے۔ مگر وہ ابو بنا چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اس کیفیت سے عورتیں اتنی محظوظ ہو گئیں کہ ایک دوسرے کو دھکے دے کر راحت علی پر گرنے کی کوشش کرنے لگیں۔ خود ساجدہ کی یہ حالت تھی کہ چمکتا ہوا سہری رنگ لہو لہان ہو رہا تھا۔ آنکھوں کا کاجل ملا پانی گاؤں پر پھیل گیا تھا اور راحت علی کے بست کو دیر تک پکڑے پکڑے اور نچاتے نچاتے اس کا انگوٹھا بات کے سینے میں پوسٹ ہو گیا تھا۔

پھر جب ”بیزی گھوڑی“ میں گھی لگے اٹھ کثورے کو سیدھا کرنے کی باری آئی تو ساجدہ نے کثورے کی طرف بڑھتے ہوئے راحت علی کے ہاتھ کی ہڈیاں پر ٹھوٹ چاندی کے ایک لگن کے سرے اتنے زور زور سے مارے کہ کثورے کی سیدھا کرنا تو ایک طرف رہا، راحت علی کثورے کو چھوٹی نہ رکا۔ عورتیں بختی رہیں اور اسے میاں بدھوجی حضور بستاخان کے سے اقبال سے نوازتی رہیں اور ساجدہ کی چٹوں میں زیادہ شدت اور بے رحمی پیدا ہوتی گئی۔ ایک بار عبد الحمان نے بھی اسے چپکے سے ٹھوکا دیا مگر راحت علی کے اٹھ پر لگن کے نکلیے سرے اسی طرح بجھتے رہے اور کہیں کہیں سے خون بھی پھوٹ لکلا۔ پھر یا کیا یک راحت علی کو نہ جانے کیا ہوا کہ اس نے لپک کر ساجدہ کی چوریوں بھری کلائی دیوچ لی۔ کانچ کی چوڑیاں چھینک کر ٹوٹیں اور ہر طرف سرخ اور بیز بلور کے لکڑے بکھر گئے۔ چند کر چیاں ساجدہ کی جلد میں گھس گئیں اور اس نے چیخ مار کر لگن گرا دیا۔ اس کلکش میں ”بیزی گھوڑی“ الٹ گئی اور اس کے گوشوں میں جلتے ہوئے گھی کے چراغ قریب بیٹھی ہوئی عورتوں کی گود میں جا گرے۔ یہ عورتیں بھڑک کر ٹھیک ایک دم خاموش ہو گئیں۔ ساجدہ اور راحت علی کے چہروں پر ایک عجیب سارنگ آگیا تھا۔ ایک ایسا رنگ جس کو کوئی نام ابھی تک تجویز نہیں ہوا۔ جیسے مٹی اور ہلکی اور خون اور زہر کو آپس میں ملا کر مل دیا جائے۔ عبد الحمان کے بست میں سے پہلی بار آواز آئی ”ابے کیا کرتے ہو؟ پاگل ہوئے ہو؟“ مگر راحت علی نے ترپتی پھر کتی ہوئی ساجدہ کی کلائی پر سے اپنی گرفت کی ذرا سا بھی ڈھیلانہ کیا۔ پھر اچانک ساجدہ کی چھینیں رک گئیں اور اس نے بڑی نرمی سے اپنا دوسرا ہاتھ راحت علی کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے آہستہ سے بڑے دکھ اور بڑی منت کے ساتھ کہا ”خالم! اب چھوڑ بھی دے۔“ اور راحت علی نے اس کا

ہاتھ فوراً چھوڑ دیا۔ ساجدہ نے اپنے چہرے پر اتری ہوئی لہوں کو سر کے ایک جھٹکے سے الٹا اور اپنی کلائی کے زخموں کو گھوڑتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی۔ عامی صورت کی ایک دراز قد اور تونمند لڑکی ”بیڑی گھوڑی“ کے رنگین کاغزوں میں لپٹنے ہوئے سرکندوں کے اس طرف سے بولی ”بد تیز، وحشی، ورنده۔“ پھر ساجدہ کی طرف بڑھی مگر یوں رک گئی جیسے کوئی ضروری بات کہنا بھول گئی ہو۔ پٹنی اور راحت علی کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر بولی۔ ”کمین۔“

”ہائے زرینہ۔“ کوئی بڑی بی بولی۔ گالی مت بکو۔“

برات جب واپس لاہور پہنچی تو راحت علی ہاتھ دھو کر عبدالخان کے پیچھے پڑ گیا کہ وہ اپنی بیوی سے کہہ کر ساجدہ کے رشتے کی بات کرنے میں اس کی مدد کرے۔

ایک دن عبدالخان نے راحت علی کی موجودگی میں مذاق مذاق میں یہ ذکر چھیڑا تو رضیہ نے ساجدہ کی تعریفوں کے پل باندھ دیے۔ بولی ”نہ جانے اس روز اسے کیا ہو گیا تھا۔ ویسے تو وہ ایسی لیے دیے رہنے والی لڑکی ہے کہ مجھے جسی پرانی اور آپ کی سیکلی نے بھی اس کی زبان کے بھی کوئی ایسی ویسی بات نہیں سنی۔ بس یہ ذرگلتا ہے کہ سنتا ہے اس روز پہلے تو راحت بھائی چپ چاپ بیٹھے لگن کھاتے رہے مگر اچانک اس کی کلائی پر ہاتھ مارا تو چوڑیاں کی کر چیاں اس کی جلد میں اتر گئیں۔ میں جب مکاواے پر جہلم گئی تو اس نے بتایا کہ ڈاکٹر تک لوہت پہنچی ہے اور وہ روزانہ نسلین کے ٹیکے لے رہے ہے۔ ساجدہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ رشتہ اسی چوڑی توڑ کی طرف سے آیا ہے تو میں اسے کیسے یقین دلا دیں گی کہ راحت بھائی ویسے بھٹک آدمی ہیں۔“

”میں بے چارہ شہری آدمی“ راحت علی نے صفائی پیش کی۔ ”مجھے کیا معلوم کہ“ بیڑی گھوڑی“ کس بلا کا نام ہے اور گھنی گلے کنورے کیسے اٹھ جاتے ہیں۔ خنان نے مجھے ذرا سا بتایا تو تھا مگر مجھے اس انتہا کی خبر نہ تھی۔ اس نے تو میرے ہاتھ کی ہڈیوں پر بھی گومڑاں دیے تھے۔ اب تک ہاتھ سیدھا نہیں ہوتا خدا کی قسم۔ میں اس خیال سے چپ چاپ بیٹھا چوٹیں سہتارہا کہ شاید مجھے انجان سمجھ کر اسے رحم آجائے۔ پھر جب محسوس کیا کہ ہاتھ بالکل پچھوڑا ہو رہا ہے تو میں نے بالکل انندھوں کی طرح اس کی کلائی پکڑ لی آپ ہی بتائے بھابی میں کیا کرتا؟ اس میں میرا کیا قصور ہے؟“

”جانے مجھے کیا ہو گیا تھا خنان۔“ بعد میں اس نے عبدالخان کو بتایا تھا۔ ”وہ تو مجھے خدا کا شکر بجالانا چاہیے کہ ساجدہ کی کلائی پر ہاتھ پڑنے سے اس کی چوڑیاں ٹوٹیں تو میری آنکھیں کھلیں۔ اگر چوڑیاں نہ ٹوٹیں تو قسم کھا کر کہتا ہوں خدا جانے میں کیا کر بیٹھا۔ وہ لگن میرے ہاتھ پر مارتی تھی اور چوٹ میرے دل پر پڑتی تھی۔ اور پھر یہ بھی شکر کرو کہ میں نے اس چھولیا۔ میں ایسا نہ کرتا تو خدا کی قسم پچوں کی طرح رونے بیٹھ جاتا۔ درد کی وجہ سے نہیں جانے کس وجہ سے۔ بس مجھے روٹا آ جاتا۔ عورتوں کے سامنے روٹا آ جاتا۔“

عبدالخنان اور اس کی بیوی جب بھی جہلم گئے ساجدہ کے والدین سے ضرور ملے۔ راحت علی کے خاندان جائیداد و آمدی کی فصیلیں بھی مہیا کرتے رہے۔ رضیہ نے حنان کو یہ بھی بتایا کہ جب ایک بار اس نے ساجدہ سے بھی ذکر چھیڑتا تو وہ بالکل گلا بی ہو گئی اور پھر بولی۔ ”ہمے اس روز مجھے بھی تو وہ کچھا یہے برے نہیں لگے تھے۔ راحت علی کے ماں باپ مر چکے تھے اور وہ اپنے خاندان کا واحد فرد تھا۔ اس لیے آخر میں رضیہ کے کہنے پر اس نے کہیں سے دور دراز کی ایک خالہ کا بھی سراغ لگایا جو عبدالخنان اور رضیہ کے ہمراہ جہلم جا کر بات پکی کر آئی اور تین میںے بعد کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی۔

شادی کے دن لاڑکوں نے راحت علی کو خوب بنا یا مگر وہ احتمالوں کی طرح چپ چاپ بیٹھا ہتا رہا۔ جہلم ہی سے اس کے لیے ایک شہ بالا ڈھونڈ نکلا گیا جس نے ساجدہ کی خاص سہیلی زرینہ کے ہاتھوں چاندنی کے ٹھوس لگن کی تین چار چوتھیں کھانے کے بعد راہ فرار اختیار کر لی اور لاڑکوں کو تراہتا ہوا ایک کھڑکی میں سے کودا تو ایک انگلی تزویہ بھیجا مگر اسے پھر سے پکڑ کر لا بھایا گیا اور اس کے زخم پر نمک چھڑک کر اس پر پتی باندھ دی گئی۔ اس پر وہ گالیوں پر اتر آیا مگر راحت علی مکر اتارہا اور انگلی نگلی گالیوں بھرے گیت سنارہا اور سوچتارہا کہ جب وہ سہیلی بار ساجدہ سے تھائی میں ملے گا تو اس کی کلائی پر سے ٹھوس سونے لگن اتار کر جو اس نے ساجدہ کے لیے بڑے شوق سے بنائے تھے اپنا ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دے گا اور کہے گا ”لو بجو۔ فرض کرو کہ میں گھنی لگا کٹورا لئنے لگا ہوں۔“ مگر ساجدہ اس کے سامنے بار بار زخمی کلائی کو باسکیں ہاتھ میں لے کر چیچھے ہٹتی ہوئی ابھرتی رہی اور وہ سوچتارہا کو وہ اس کی کلائی پر کہاں پیار کرے گا اور اگر کلائی پر چوڑیاں ہوں میں تو انہیں کتنی نرمی سے ادھر ادھر ہٹا کر اپنے ہونٹوں کے لیے جگہ بنائے گا۔

شادی کے بعد راحت کو ساجدہ کے ساتھ صرف دو دن گزارنے کا موقع ملا مگر ان دو دنوں میں اسکی کیفیت ایسی رہی جیسے وہی اعصاب زدگی کا پر اتنا میریض ہے۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا اور ہتھیلیاں اور تلوے ہر وقت پیسج رہتے تھے۔ عبدالخنان نے اسے سمجھایا بھی کہ دولہاوں کے تھوڑے نہیں ہوتے مگر راحت علی بولا ”میں کیا کروں حنان! میں ابھی تک یہ فیصلہ ہی نہیں کر پایا کہ میں اس لڑکی سے پیار کروں یا اس کی پوچا کروں یا اس سے نفرت کروں۔ وہ جس نے میرے ہاتھ کی ہڈیاں تو ٹڑاں تھیں اب دلہنوں کی روائی حیا میں یوں پہنچی پہنچائی پڑی ہے کہ جب چاہوں اسے اٹھا کر سینے سے لگا لوں۔ نہ وہ ہاتھ جھکتی ہے نہ پاؤں پختتی ہے۔ بس دو مرطے باقی ہیں۔ میں اس کے حسن کو ہضم کروں اور وہ اپنی حیا کو ہضم کرے۔ پھر تمہیں سم سمجھ کا دلہا بن کر بھی دکھادوں گا۔ لیٹ ہو جاؤں گا مگر لیٹ گاڑیاں بھی تو منزل مقصود پر پہنچ جاتی ہیں۔“

عبدالخنان نے یہ باتیں سن کر ایک مہم احتمال قہقہہ مارا تھا اور چلا گیا تھا۔

اسی وقت ساجدہ کا بھائی آپنچا تھا اور اب وہ مکلاوے پر جہلم جا رہے تھے۔ راستے میں وہ ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کر سکے تھے

کیونکہ ساجدہ کا بھائی قریب ہی بیٹھا تھا۔ بس راحت علی ساجدہ کو دیکھتا رہا اور ساجدہ ایک رسالے کے پیچھے بیٹھی لجاتی اور خوش ہوتی رہی۔ پھر جب بھائی تازہ ہوا کی خاطر پر لی طرف کھڑکی کے پاس جا بیٹھا اور گاڑی جہلم کے پل سے گزرنے لگی تو ساجدہ نے رسالہ ایک طرف رکھ دیا اور پل کی گرج کو ایک لمحہ کان وہر کرنے کے بعد اس نے کہا ”ارے! ایسا لگتا ہے کہ ”جہلم جہلم“ پکارتا ہے۔“ اس پر راحت علی نے کہا ”تمہیں اپنے میکے جانے کا کتنا شوق ہے سجو! یہ شہیک ہے کہ ان دونوں میں بھی تمہارے میکے ہی میں رہوں گا“ پر ایسا لگتا ہے کہ تمہارے ماں باپ دو تین دن کے لیے تمہیں مجھ سے چھینے لے جائے ہیں۔ سچ کہتا ہوں سجو! میں نے تو ابھی تمہیں جی بھر کر دیکھا ہی نہیں۔ تمہیں کیا پتہ کہ میرے ہاتھوں کی بڈیاں تمہارے نگنوں کی چونیں کھانے کے لیے کتنی مدت سے بے قرار ہیں۔ مگر میں تمہارے انتظار میں اتنی مدت تک جا گئے رہنے کے بعد ابھی آنکھیں ہی مل رہا تھا کہ تمہارا بھائی تمہیں لینے آگیا۔ بات سنو! یوں کریں کہ جہلم میں اتریں ہی نہیں۔ پنڈی کی طرف بھاگ جائیں۔“

اس پر ساجدہ جس طرح مسکرائی تھی وہ ایک محیب مسکراہٹ تھی۔ اس مسکراہٹ میں حیا بھی تھی، غرور بھی تھا اور اس شکاری کی خود آسودگی بھی جو ہر ان کو جال میں پھنسا دیکھ کر اسے جال میں سے نکالنے اور ذبح کرنے سے پہلے ناگلیں پھیلا کر بینچھا جاتا ہے اور آنکھیں بند کر کے سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگانے لگتا ہے۔

جہلم میں دو روز کے قیام کے بعد ساجدہ پہلی بار راحت علی سے تہائی میں ملی۔ وہ اس وقت اپنے کمرے میں، گلی کی طرف کھلنے والے دروازے کو شیم واکے بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ ساجدہ نے آتے ہی گلی والا دروازہ بند کر دیا اور اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی تو راحت علی چونکا سانظر آنے لگا اور بولا ”کیا بات ہے؟“

ساجدہ کی مسکراہٹ اس کے چہرے پر بھوجھل سا بکھیر کر بیٹھ گئی۔ اب راحت علی کے بجائے وہ خود چوکی چوکی نظر آنے لگی اور بولی ”کیوں کیا بات ہے؟“

Rahat Ully نے جیسے سمجھ لیا اور اپنے آپ کو سنبھالنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور شہلنے لگا۔ ساجدہ کچھ اس طرح حیران اور اداس کھڑی رہ گئی جیسے وہ دودھ کا ایک پیالہ رکھ کر پل بھر کے لیے اندر گئی ہو مگر واپس آئی ہو تو ملی سارا دودھ پی چکی ہو۔ پھر وہ بہت دور سے آنے والی آواز میں بولی ”میں آپ کو یہ بتانے آئی تھی کہ امی اور اب انے اجازت دے دی ہے اور ہم آج شام کی گاڑی سے لا ہو رہا ہے ہیں۔“

Rahat Ully نے اسی طرح جعلتے ہوئے اور ساجدہ کی طرف دیکھے بغیر کہا ”رکنا چاہو تو دودن اور رک جاؤ۔ میری طرف سے اجازت ہے۔“

یہ کہہ کر وہ پلٹک پر بیٹھ گیا اور ساجدہ پر کچھ ایسا گوگو کا عالم طاری ہو گیا جیسے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ اپنے دو لہا کی اس فراخ دلی پر

خوش ہو کر اندر بھاگ جائے یا بڑھ کر اس کا منہ نوچ لے۔ وہ ایک لمحہ میں کھڑی راحت علی کو دیکھتی رہی جیسے اسے پہچانے کی کوشش کر رہی ہے۔ پھر اسے آنکھا بہت سار دنا آگیا۔ وہ پلٹگ پر ذرا سائک گئی اور راحت علی کے سینے پر رکھ کر اور بازوؤں کو اس کے شانوں پر ڈال کر بولی ”نمیں راحت آج ہی چلیں گے اور شام ہی کی گاڑی سے چلیں گے۔“

”بہت اچھا چلوا!“ راحت علی ساجدہ کے بازوؤں کا حلقوں توڑ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ مگر یوں بولا جیسے اگر نہ بولتا تو پھر کر مر جاتا۔

وہ اسی روز جہلم سے چلے آئے۔ پھر کوئی ایک مہینہ بعد جب جہلم میں ساجدہ کی امی اور ابا اور دوسرے گھروالے بیٹھے اس موضوع پر باتیں کر رہے تھے کہ لاکیاں بیا ہے جانے کے بعد یا کیا یک ساجدہ آئی اور اپنی ماں سے لپٹ کر پھوٹ کی طرح بلکن لگی۔ سب لوگ حواس باختہ سے ہو گئے۔ پھر ساجدہ کیا با کچھ کہے بغیر باہر لپکے کہ راحت علی کو بھی اندر لے آئیں، مگر وہاں راحت علی کے بجائے اس کا ملازم ایک بکس لیے کھڑا تھا۔ اس نے سلام کر کے بکس ان کے حوالے کیا اور رہنا ہو افقرہ طوطے کی طرح دھرا دیا:

”صاحب نے سلام بولا ہے اور بولا ہے کہ نیگم صاحب اپنی مرضی کا مالک ہے اور ہم اس کے ساتھ زور آوری کیسے کر سکتا ہے؟“  
ایک دم ساجدہ کی رشتہ داروں اور سہیلیوں سے بھرا ہوا پورا محلہ اٹھ آیا۔ رات گئے تک بات بات پر ناکوں پر انکھیاں رکھی جاتی رہیں اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اور بھویں اچکا اچکا کر مختنڈی سائیں بھری جاتی رہیں۔ آخر کار ساجدہ کی امی سے سینہ پر سینہ چلتا ہوا راز پورے ہجوم میں یوں عام ہوا کہ راحت علی تھوڑا سا پاگل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم خوبصورت تو ہو مگر صرف خوبصورت ہو، تمہاری خوبصورتی دبدبے سے خالی ہے۔

”یہ بدیہ کیا ہوتا ہیں؟“ بتانے والی سے کسی نے پوچھا۔

اور وہ بولی ”یہ بھی ہوتا ہے۔ پر یہاں نہیں ہوتا۔ ادھر بڑے بڑے شہروں میں ہوتا ہے۔“ پھر اس نے راحت علی کے پاگل پن کی وضاحت جاری رکھی۔ ”وہ کہنے لگا ساجدہ بی بی سے کہ میں تمہیں دور سے دیکھ کر دھوکا کھا گیا تھا۔ میں سمجھا تھا تم جیسا جاگتا سانپ ہو، پر تم تو رسی نکلیں۔“

”ہائے یہ کہا اس نے؟ یہ کیا کہا اس نے؟“ کسی نے پوچھا۔

اور بتانے والی بولی ”اے میں کوئی پاگل ہوں کہ پاگلوں کی باتوں کا مطلب بتاتی پھروں۔ ہاں تو پھر بہن مہری بی کہہ رہی ہیں کہ کل تو غصب ہو گیا۔ کل جب ساجدہ نے سوتے ہوئے راحت علی کو یونہی ذرا سا چھولیا تو اس نے ساجدہ کے منہ پر اٹھے ہاتھ کا تھپڑ دے مارا اور بنکار نے لگا کہ تم صرف خوبصورت ہو۔ تم صرف ایک عامی عورت ہو۔ شادی سے پہلے میں نے تمہارے حسن کے ہاتھ میں جو تکوار دیکھی تھی،

وہ کہاں ہے؟ جاؤ۔ اپنے آپ کو میری نفرت سے بچا لے جاؤ۔“  
”پاگل ہے۔ صاف پاگل ہے۔“ کسی نے کہا۔

” بد تیز ہے، جشی ہے درندہ ہے۔“ زرینہ وہیں ساجدہ کے گھٹنے کے پاس بیٹھی ہوئی چلا اٹھی۔ ” ہمے ہجوا قسم پروردگار کی۔ میں تمہاری جگہ ہوتی تو اسے چھٹی کا دودھ یاد دلا دیتی۔ اری میں پوچھتی ہوں اس نے تمہارے منہ پر تھپڑ مارتا تو کیا تمہارے ہاتھ پر فانج گر گیا تھا؟ جواب میں تم اسے تھپڑ مارنے کے بجائے رونے لگیں اور پھر میکے بھاگ آئیں۔ میں ہوتی تو قسم پروردگار کی اسے دونوں کانوں سے پکڑ کر جھلاتی اور پوچھتی کہ کیوں میاں! اب بتاؤ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں۔“ پھر ذرا سار کر کر بولی۔ ” کہیں۔“

دوروز بعد جب سارا گھر صحن میں بیٹھا اس خاندانی الیے پر بات چیت یہ رہا تھا یہاں کیک راحت علی اندر آیا اور السلام علیکم کہہ کر ایک کرسی پر یوں بیٹھ گیا جیسے وہ بفتون سے بیٹھیں مقیم ہے اور ابھی کچھ دیر پہلے یونہی ہوانخوری کو نکل گیا تھا۔ وہ بیٹھا تو بہت سے لوگ کھڑے ہو گئے اور ساجدہ اندر بھاگ گئی۔

کم و بیش ایک ہفتے تک راحت علی سب کو یہ یقین دلانے میں مصروف رہا کہ ساجدہ اسے غلط سمجھی ہے اور اس کے منہ پر تھپڑ مارنے کا قصہ یہ ہے کہ وہ سینے پر دونوں ہاتھوں کے گہری نیند سورہاتھا۔ جب اچانک ہڑبڑا کر اٹھا تو اس کا الٹا ہاتھ ساجدہ کے منہ پر جالا۔ اگر پلنگ کی دوسری پٹی پر کوئی اور بیٹھا ہوتا تو دوسرا ہاتھ اس کے منہ پر پڑتا اور اس حادثے میں اس کی نیت کا کوئی دخل نہیں ہے۔ سب گھروالے راحت علی کی ان مسلسل وضاحتوں سے متاثر ہو چکے تھے۔ اور اب تو زرینہ اور دوسری سہیلیاں جب ساجدہ کے رخسار پر ہاتھ پھیر کر اس کے ساتھ بناؤٹی ہمدردی کرتی تھیں تو ساجدہ بھی بہن دیتی تھی اور کہتی تھی۔ ” اللہ کرے تمہیں بھی ایسے شوہر نصیب ہوں کہ سوتے میں گھبرا کر اٹھیں تو بے خیالی میں تمہارے گلوں گھونے دے ماریں۔“ سہیلیاں بہتیں اور راحت علی اپنے کمرے کا گلی میں گھلنے والا دروازہ نیم واکے بیٹھا سکریٹ پھونکتا رہتا۔ سہیلیاں اب راحت علی کو بھی چھیڑے گئی تھیں۔ اور زرینہ تو کہیں سے ایک کھلونا لے آئی تھی۔ یہ کھلونا ایک گذے اور گڑیا پر مشتمل تھا۔ کھلونے میں کوک بھر کر اسے ہتھیلی پر رکھ لیا جاتا تو گذہ ابیٹھے بیٹھے یہاں کیک اٹھتا اور ہاتھ بڑھا کر گڑیا کے منہ پر طما نچ مارنے لگتا اور گڑیا دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر اپنے جسم کو یوں جھکلے دیتی جیسے روہی ہے۔ کچھ دیر کے بعد گذہ ابیٹھے جاتا اور گڑیا حیران کھڑی رہ جاتی۔ اس پر سارے گھر میں خوب قیقبہ پڑتے۔ اور جب ایک روز راحت علی نے زرینہ کے ہاتھ سے یہ کھلونا چھیننا چاہا تو زرینہ کی کلائی ایک چوڑی ٹوٹ کر اس کی ہتھیلی میں گھس گئی۔ وہ ہاتھ کو گھٹنوں میں دبا کر بیٹھ گیا تو زرینہ بولی ” میں ساجدہ نہیں ہوں مسٹر! میں تو زرینہ ہوں اور میری چوڑیاں تو ان ہاتھوں کو دس لیتی ہیں جو انہیں توڑنا چاہتے ہیں۔“

پھر ایک روز جب رات کے گلارہ بجے تک کیرم اور تاش کھینے کے بعد سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلی گئی تھیں تو ایک بجے کے

قریب دروازے پر مسلسل دستک ہونے لگی۔ معلوم ہوا زرینہ کی امی اپنے ملازم کے ساتھ زرینہ کو لینے آئی ہیں۔ زرینہ تو یہاں سے گیارہ بجے ہی چلی گئی تھی۔

سب لوگ پکارنے اور زرینہ کی ماں چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپا کرو ہیں دروازے پر بیٹھ گئیں۔ سارے گھر میں بھگلڈر مجھ گئی۔ پھر کسی نے آ کر اطلاع دی کہ راحت علی بھی اپنے کمرے میں نہیں ہے اور اس کے کمرے کا گلی والا دروازہ پانوپاٹ کھلا ہے۔ ایک لمحے تک سب کھڑے ایک دوسرے کامنے شکتے رہے اور پھر سب ایک دم راحت علی کے کمرے کی طرف بھاگے۔ وہاں پہنچ کر وہ پھر ایک دوسرے کا منہ شکنے لگے مگر پھر ساجدہ نے بے ہوش ہو کر سارا معدخل کر دیا۔

فوراً زرینہ کے نوجوان رشتہ دار ایک کار میں شخص بھسا کر لا ہو کی طرف روانہ ہو گئے اور ساجدہ کے ابا نے عبدالخان کو تاریخجا کر فوراً پہنچو۔ مگر جب تک یہ معدخل ہوتا، راولپنڈی سے اپنی امی کے نام زرینہ کا خط آچکا تھا کہ ہم بخوبی ہیں اور آپ کی خیریت نیک مطلوب ہے۔ صورت احوال یہ ہے کہ ہمیں معاف کر دیجئے۔ چھوٹے غلطیاں کرتے رہتے ہیں اور بڑے معاف کرتے رہتے ہیں۔ اور آپ ہمیں معافی کی چھٹی لکھ دیں تو ہم دونوں آپ کی قدم بوی کے لیے فوراً حاضر ہو جائیں گے۔

راحت علی جب ساجدہ کو مکلاوے پر جہلم لا یا تھا اور سرال میں اپنی بہت سی نئی رشتہ داروں اور ساجدہ کی سہیلیوں میں گھرا ہوا صوف پر جا کر بیٹھا تھا اور سامنے دیکھا تو یہاں ایک اسے محسوس ہوا تھا کہ اس نے ساجدہ سے شادی کر کے جھک مار دی ہے۔

”یہ کون ہے؟“ اس نے سوچا تھا۔ یہ جو ساجدہ کے بالکل الٹ ہے۔ لیکن پھر بھی خوبصورت ہے جس کی نسوانیت میں مردانہ وجہت ہے اور جس کا رنگ اتنا لٹھ ہے کہ زبان تک کو اس کا ذائقہ محسوس ہوتا ہے۔ جس کی آنکھیں صرف اتنی بڑی ہیں کہ اس سے بھی بڑی ہوں تو مصنوعی معلوم ہوں۔ ہر پلک بلال کی طرح خمیدہ ہے۔ خوب گھری اور جڑی ہوئی بھویں ہیں۔ بظاہر موٹی سی گولی ناک ہے، لیکن اگر اس چہرے پر ساجدہ کی سی ناک ہوتی تو پورے چہرے کا ناس مار دیتی۔ بھرے بھرے ہونت ہیں جن کا رنگ سبزی مائل سرخ ہے جیسے بہت سازہر آلود خون پڑے پڑے جنم گیا ہو۔ عزم سے بھری ہوئی ٹھوڑی ہے۔ گردن میں نیلی نیلی رگیں ہیں۔ جسم کے خطوط میں رعنائی بھی ہے اور تو انکی بھی۔ یعنی ایسا بھر پور پن جس کی وجہ سے سارا جسم کسا کسا نظر آتا ہے۔ راحت علی نے سوچا تھا کہ اگر میں مصور ہوتا تو اس لڑکی کی تصویر کھیچ کر اس کے نیچے ”حوا“ لکھ دیتا۔

ایک ساتھ سب نے اس لڑکی کی طرف دیکھا جس کی طرف راحت علی مسلسل دیکھے جا رہا تھا۔ پھر وہ بولی تھی ”ہانے دو اسجاں تو مجھے بالکل ندیدوں کی طرح دیکھے جا رہے ہیں۔“

ہانے زرینہ کوئی بڑی بی بولی۔ ”گالی مت بکو۔“

"گالی مت بکوزری۔" راحت علی نے راولپنڈی کے ایک ہوٹل میں اپنے کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ "میں تو تمہیں اپنا ایک خیال بتا رہا تھا۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ دنیا کی ساری عورتیں چاہے وہ ساجدا ہیں ہوں چاہے زرینا ہیں جب بیوی بن کر مرد کے قریب آتی ہیں تو اپنی شخصیت کے خول میں سے نکل آتی ہیں اور سیدھی عام عورتیں بن جاتی ہیں۔"

میں تو تمہیں یہ بتا رہا تھا کہ ساری دنیا میں صرف ایک عورت بنتی ہے۔ البتہ ہر گھر میں اس کا نام مختلف ہے۔"

"پھر وہی بک بک۔" زرینہ کڑک کر بولی۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ زرینہ کے نام اس کی امی کا خط آیا تھا۔ دنیا کی تمام ماوں کی طرح انہوں نے بھی یہ کڑوی گولی آنکھیں بند کر کے نکل لی تھی۔ انہیں فوراً جہلم بلا بھیجا تھا اور یہ فرمائش بھی کی تھی کہ آتے ہوئے میرے لیے مری کی تین چار باسکھیں بھی لیتی آنا۔

"اس کا مطلب تو یہ ہے۔" راحت علی نے کہا "کہ تمہاری امی ہم سے نہ صرف خناہیں ہیں بلکہ خوش ہیں۔"

"خوش کیوں نہ ہوں۔" زرینہ بولی "میں نے انہیں باقاعدہ شادی کے دس ہزار کے خرچے سے بچایا ہے کہ نہیں؟"

دوسرے دن دوپہر کو دونوں جہلم پہنچ توزرینہ کی ماں دس منٹ تک زرینہ کو سینے سے لگائے روئی رہیں۔ وہاں سے فارغ ہو کر انہوں نے راحت علی کے سراو پر پہنچ پر تین چار بار رہا تھا پھر اور اس کا کندھا چوما۔ پلت کروہ زرینہ سے پٹ گئیں۔ اور راحت علی نے ایک کرسی پر بیٹھ کر اپنی سامنے جیب میں سے کنگھی نکالی اور بال سنوارنے لگا۔

ایک دم اکٹھی بہت سی پڑوں میں قطار اندر قطار صحیح میں املا پڑیں اور زرینہ اس کی امی اور راحت علی ان میں گھر کر رہ گئے۔ بیشتر عورتیں انہیں یوں حرست سے دیکھے جا رہی تھیں جیسے وہ کوئی بہت بڑا معمر کہ سر کر کے لوٹے ہیں۔ اکادا نوجوان لڑکیوں نے راحت علی سے چھیڑ کر بھی کوشش کر اور بعضوں نے اپنی چوریوں بھری کلائیاں بھی اس کے سامنے یہ کہہ کر پھیلادیں کہ شاید وہاں میاں کے بت میں اسی بہانے کوئی حرکت پیدا ہو۔ مگر زرینہ قتنقہ لگاتی رہی اور راحت علی یوں چپ چاپ بیٹھا رہا جیسے اس کے سامنے عورتیں نہیں کھڑی ہیں۔ "بیڑی گھوڑی" رکھی ہے۔

اوھر زرینہ کی امی اپنی ہم سنوں کو بتا رہی تھیں "بہنا! بھاگتی سب ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ زرینہ چھپ کے بھاگی تھی اور ساجدہ دن دھاڑے ڈھول بجا کر بھاگی تھی۔ رہا حق مہر تو کل دس ہزار ہی تو ہے۔ میں کہتی ہوں مہر لی بی کو بلا بھجو۔ میں ابھی اسی وقت اس کے ہاتھ میں سو روپے کے سوتوں نہ تھا دوں تو زرینہ کی ماں نہیں۔"

Rahat Ali کے چہرے پر اچانک ایک عجیب سارنگ آگیا۔ ایک ایسا رنگ جس کا کوئی نام ابھی تک تجویز نہیں ہوا، جیسے مٹی اور ہلہدی اور خون اور زہر کو آپس میں ملا کر مل دیا جائے۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور سامنے دیکھنے لگا۔ پھر سب نے پلت کر اس طرف دیکھا اور سب کے چہروں

پرمی اور ہلدی اور خون اور زہر کے رنگ بھر گئے۔ سب نے جیسے کسی غیر شعوری حکم کی تعییل میں ادھر ادھر ہٹ کر راحت علی تک ساجدہ کے لیے راستہ بنادیا۔

ساجدہ کے ساتھ صرف ایک عورت تھی جو شاید گھر کی ملازمت تھی۔ ساجدہ نے ناقاب الٹ رکھا تھا۔ اس کا چہرہ فتح تھا۔ ہونٹ سختی سے بھیج کر غائب سے ہو گئے تھے اور وہ کچھ یوں چل رہی تھی؛ جیسے سر سے پاؤں تک شدید تنفس میں بٹتا ہے۔  
وہ آنکھیں جھپکے اور ادھر ادھر دیکھے بغیر سیدھی راحت علی کی طرف آئی۔ اس کے قریب آ کر رک گئی۔ اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھنے لگی اور پھر ایک دم جیسے کوک بھری مشین کی طرح اس نے دونوں ہاتھوں سے راحت علی کے منہ پر تھپڑوں کی بوچھاڑ کر دی۔ راحت علی بازو لٹکائے یوں چپ چاپ کھڑا رہا جیسے ساجدہ کی چوڑیوں کے چھنا کے سن رہا ہے۔ پھر اچانک اس کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی اور اس نے ساجدہ کی چوڑیاں بھری کلائی دبوچ لی۔ کافی کی چوڑیاں چھینک کر ٹوٹیں اور ہر طرف سرخ اور سیز بلور کے کنکڑے خون اور زہر کے قطروں کی طرح بکھر گئے اور ساجدہ کی کلائی کے خون سے راحت علی کی انگلیاں بھیگ گئیں۔ ساجدہ دیوانوں کی طرح راحت علی پر جھپٹی اور اس کے ہاتھ میں اپنے دانت گاڑ دیے اور جب راحت علی کے ہاتھ سے نکلتے ہوئے خون کی ایک دھار اس کی کہنی تک بہہ آئی تو زرینہ ہکابکا عورتوں کو چیرتی ہوئی آئی اور ساجدہ کو کندھے سے جھٹک کر چینی۔ ”یہ کیا بکواس ہے؟“

ساجدہ نے راحت علی کے ہاتھ پر سے ہونٹ ہٹا ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی کلائی چھڑائی اور اپنے دانتوں پر پھیلا ہوا راحت علی کا خون زرینہ کے منہ پر تھوک دیا۔ زرینہ دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر روٹی ہوئی وہیں بیٹھ گئی اور ساجدہ واپس جانے کے لیے پٹی ہی تھی کے اندر کمرے میں سے زرینہ کی ای سوسو کے سونوٹ ہاتھ میں لیے ہوئے چھینچ چلاتی باہر نکلیں اور پکاریں ”یہ لے اپنا دس ہزار کا حق مہرجس کی خاطر تو میری بیٹی کو کاشتی پھر رہی ہے۔ میں تو جھبھے تیرے ہوتوں سوتوں سمیت قربان کرڈاں اس جوڑے پر سے۔“

ساجدہ نے جس کے ہونٹ راحت علی کے خون سے سرخ ہو رہے تھے ذرا سار کر زرینہ کی ای کی طرف بے پناہ نفرت سے دیکھا اور پھر رستہ بناتی ہوئی عورتوں کے ہجوم میں گزر کر چلی گئی۔

”لائیے لائیے مجھے دے دیجئے۔“ راحت علی نے زرینہ کی ای کی طرف اپنا زخمی ہاتھ کیا۔

”یہ لے بیٹا۔“ انہوں نے نوٹوں کا پاندہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

”یہ روپے آپ نے مجھے دیے ہیں نا؟“ اس نے پوچھا  
”ہاں ہاں بیٹا۔“ وہ بولیں۔

اور راحت علی نے یہ پاندہ روٹی ہوئی زرینہ کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا ”تو میں نے آپ کی بیٹی کی دیے۔“  
یہ کہہ کر وہ یوں باہر لپکا جیسے ذرا سا بھی رک گیا تو اسے بہت دیر ہو جائے گی۔ زرینہ نے یہ دیکھا تو کھڑی ہو گئی اور آنکھیں پھاڑ کر اسے

جاتا دیکھنے لگی۔ اور اس کی امی دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر روتی ہوئی وہیں بینہ گئیں مگر راحت علی لپکا چلا گیا۔ وہ بارہڑک پر آگیا اور بھاگنے لگا۔ دور ایک تانگے میں ساجدہ کے باہم اس کا بھائی اور عبدالحنان اس کی طرف آرہے تھے مگر وہ انہیں نہ دیکھ سکا۔ وہ تو صرف ساجدہ کو دیکھ رہا تھا جس سے اب وہ صرف پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔



# شیش محل

”شرم کرو بیٹکو۔“

یہ الفاظ ملک کرم الہی کا تکیہ کلام بن چکے تھے۔ سر را ہے یا چوپال پڑ جنازے میں شادی پڑ جہاں بھی ان کی مدد بھیز اللہ بخش موجودی سے ہوتی، ان کی بھویں سکر جاتیں اور وہ کہتے ”شرم کرو بیٹکو۔ علاقے کے اتنے بڑے کاریگر ہو ہر سال ڈھائی تین سو روپے کماليتے ہو گر سر چھپانے کو پھونس کا ایک چھیر بھی نہیں بن سکتے۔ کبھی ایک کے گھر میں، کبھی دوسرے کی چوکھت پر۔ شرم کرو۔“

”شرم تو بہت آتی ہے ملک جی۔“ اللہ بخش نے ہاتھ مردود ہوتے ہوئے ایک روز کہہ ہی ڈالا ”پر کیا کروں اسال نہیں گزرتا کہ بچہ ہو جاتا ہے۔ گنتی بھول جاتا ہوں پیر دشیر کی قسم!“

ملک کرم الہی پوچھنا تو یہ چاہتے تھے کہ پھر تم اتنے بڑھیا کپڑے کیوں پہننے ہو۔ مگر جب بھی یہ خیال ان کے زہن میں آیا۔ ساتھ ہی یہ خیال بھی آگیا کہ اگر اللہ بخش کو اس کے اچھے لباس پر نوکری کیا تو وہ سمجھے گا ملک جل گیا ہے۔ اسی لیے انہوں نے اللہ بخش پر ایک اور رخ سے حملہ کیا۔ ”اچھا بتا“ کتنے بچے ہیں تیرے؟“

الله بخش انگلوں کی پوروں کو انگوٹھے سے چھوٹے ہوئے گئے لگا۔ ”پھلا طوبہ رائی ستاں زبیدہ“

”زبیدہ؟“ ملک کرم الہی کے تیور کچھایے ہو گئے جیسے دودھ میں مکھی گر پڑی ہو۔ ارے تیری ایک بیٹی کا نام زبیدہ بھی ہے؟“  
الله بخش کھیا کر مسکرا دیا۔ آپ کی موجودن جانے کہاں سے اچھے اچھے شہری نام سن آئی۔ یہ رکی ہوئی تو میں نے اس کا نام بانو رکھا پر اس نے زبیدہ پکارنا شروع کر دیا۔ میں نے سوچا زبیدہ ہے تو زبیدہ ہی سمجھی۔ اپنا کیا بگرتا ہے۔ تو وہ میں پائچ گن چکا تھا چھٹا حفیظ اور ساتواں الطاف۔“

”حفیظ اور الطاف؟“ ملک کرم الہی اب کے توہ کابکارہ گئے ”کیا یہ نام بھی بھاگی نے رکھے؟“

”بھی نہیں یہ تو میں نے رکھے۔“ اللہ بخش بچوں کی طرح شرم گیا۔

”حفیظ پتواری اور الطاف تھانیدار کے نام پر۔“

”بڑا شوق ہے بڑا آدمی بننے کا۔“ ملک صاحب بولے ”پر بڑے آدمیوں کے تواپنے مکان بھی ہوتے ہیں نا۔“ یہاں کیا کہیں جیسے کچھ یاد آگیا۔ ”اچھا بتا“ تیری شادی کو کتنے سال ہوئے؟“

اللہ بخش نے انگلیوں کی پوروں پر پھر سے انگوٹھا چلا یا اور بولا "یہی کوئی دس ایک سال ہوئے ہوں گے۔"

"مکی کرم الہی نے مجھے اللہ بخش کو پکڑ لیا" دس سال میں سات بچے بھی کوئی بچے ہیں؟"

"دوسرا بھی بچے ہیں۔" اللہ بخش نے اطلاع آ کھا۔ پھر جیسے وہ اس سماں ہو گیا۔ بولا اکٹھی پیدا ہوئے اور ایسے پکے دوست نکلے کہ اکٹھے مر گئے۔

"حساب ان کا کیا جاتا ہے جو بھی رہے ہیں۔" ملک کرم الہی بولے۔

"کل سات ہوئے۔ اور گلے موچی کے کتنے ہیں؟"

"کل تیرھواں ہوا۔"

"کیا وہ تم سے بڑا کاریگر ہے؟"

"اسے تو ملک جی! اب تک جوتا گانختا بھی نہ آیا۔"

"پھر کیا وہ مانگے کے مکان میں رہتا ہے؟"

اللہ بخش، ملک کرم الہی کو خالی خالی آنکھوں سے گھوڑتارہ گیا۔

ملک صاحب بولے "اس کے تیرہ بچے ہیں۔ بڑی لڑکی کی شادی بھی کر چکا ہے۔ اس سے چھوٹی کام بھی تیار ہے۔ اس کی موجودن بھی آئے دن یہاں رہتی ہے۔ اور کہا تا ہو گا میں میں یہی کوئی پانچ چھروپے۔ سال کے سانچھ ستر کرو۔ مگر اس کا اپنا مکان ہے اپنی دکان اور کوئی بھی جن کے دروازوں پر کپکی اینٹوں کی ڈاٹ ہے۔ ہے نا؟"

"جی۔" اللہ بخش نے جواب دیا۔

"شرم کرو بٹکلو۔" ملک صاحب نے بھویں سمیٹ کر کہا "اس کا اپنا مکان اور اپنی دکان ہے اور تم اس تاک میں رہتے ہو کہ کوئی کسان باہر کھیتوں میں اٹھ جائے تو تم میں دو میئنے کے لیے اس کے کوئی نہیں۔ اس کے کوئی پانچ چھروپے۔ آج کل فصلیں کث رہی ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد فصلیں اٹھیں گی اور کسان واپس گاؤں میں آ جائیں گے تو تم اپنے اوزار پر رکھ کر اپنے بچوں کا ریوڑہ انک کر بھکاریوں کی طرح گھر گھر میں جھاٹکتے پھر دے گے۔ شرم کرو۔"

اللہ بخش چھوٹا سا تھا جب اس کا پاب مر گیا۔ ماں اس سے پہلے مر چکی تھی۔ ایک بیاہتا بہن گامی تھی جو اسے یعنی سے لگا کر اپنے ہاں لے گئی۔ اس کے شوہرن نے تاک بھوں چڑھائی مگر جب اللہ بخش دکان میں بیٹھ کر پرانے جوتے گانختے کا کام کرنے لگا تو اس نے سوچا کہ دو وقت کی روٹی اور سال دو سال کی اترن پر یہ سودا کچھ ایسا مہنگا نہیں۔ پھر ایک ساون میں اللہ بخش کے مکان کی چھت گر پڑی تو گامی یوں

ہے؟"

روئی پہنچی جیسے اس کے ماں باپ کے جنازے جاتے جاتے الٹ پڑے ہیں۔ گامی کے شوہرنے اسے سمجھایا کہ اللہ بخش ہونہا رکار گیر ہے۔ جوان ہو گا تو نبی چھتی ڈالوں گا۔ اور گامی! اس میں روئے کی کون سی بات؟" دو تین سال بعد ایک اور ساون میں چھتی سے محروم بھگی دیوار بھی پہنچ گئی اور گامی نے دو ہتھوں سے اپنا سینہ پیٹ ڈالا۔ شوہرنے اسے سمجھایا کہ اگر چھتیں دیواروں کے سہارے کھڑی رہتی ہیں تو دیواروں کو بھی چھتیں ڈھانچے رکھتی ہیں۔ چھت گرے گی تو دیوار بھی ڈھانچے جائے گی۔" اس لے گامی اس میں روئے پہنچ کی کون سی بات

اللہ بخش کبھی بھارا پنے گھر وندے کے کھنڈر کا بھی چکر لگا آتا۔ وہ صحیح کسی زمانے میں چڑے کی کترنوں سے اٹا رہتا تھا، اب خود رو جھاڑیوں سے بھر گیا تھا۔ چھت کا صرف ایک حصہ دیوار سے انکارہ گیا تھا اور نہ پوری چھتنا درکوٹھے میں ڈھیر پڑی تھی۔ اللہ بخش نے جب بھی یہ کھنڈر دیکھا اسے ایسا لگا جیسے وہ اپنے ماں باپ کی دھنسی ہوئی قبروں کے پاس کھڑا ہے۔ ایک دن وہ اس کے کھنڈر کے بندروں والے سے لٹکے ہوئے کالے بھنگ تالے کوٹھی میں پکڑے جھاڑیوں بھرے صحن کو گھور رہا تھا جب اوپر سے ملک کرم الہی آگئے۔ اسے چیڑھوں میں لپٹا ہوا اور یوں اوس اوس کھنڈر کیچھ کر ملک صاحب نے اسے کہیں شادی کرنے اور اپنا گھر وندے آباد کرنے کا مشورہ دیا۔ جب سے اللہ بخش کی کار گیری کی دھوم پچی تھی ملک کرم الہی اپنے گھر کے جو تے اسی سے بنواتے تھے اور اسے اچھی منصافانہ قیمت ادا کرتے تھے۔ مگر یہ رقم اللہ بخش کے بہنوئی کی جیب میں اتر جاتی تھی اور اللہ بخش کی صرف اتنی مدارات ہوتی تھی کہ بہنوئی گامی سے کہہ دیتا تھا۔ "ارے کسی دن بیٹھ کر بیٹھو کے کرتے کی مرمت کر دے۔ دیکھ تو جگہ جگہ سے کھل گیا ہے۔ گامی اپنے بھائی کا کرتی مرمت کرتی اور روئی اور کبھی کبھی چکے سے اس کے کان میں کہہ دیتی" "میرے دیر! تیری جلدی جلدی سے کہیں شادی ہو جائے اور تو اپنا مکان کھڑا کر لے تو دیکھیں تیرے بہنوئی کو کیسے کیسے جلاتی ہوں۔" اس نے کئی بار اپنے شوہر سے بھی اللہ بخش کی شادی کا ذکر کیا مگر اس نے یہ کہہ کر تال دیا کہ ایسوں کو رشتہ نہیں ملتے۔ اب ملک کرم الہی نے اللہ سے بھی بات کی تو وہ بولا "میں کیا کر سکتا ہوں ملک جی! میری کمائی تو بہنوئی لے جاتا ہے۔" ملک کرم الہی اسے ہاتھ سے پکڑ کر گامی کے گھر لے آئے۔ انہیں خوب برآ بھلا کہا اور سمجھایا بیوی تو مرد کی منزوں رجوانی کے منہ میں لگا م ہوتی ہے اور تم نے بیٹھ کو جلدی سے کہیں رشتہ نہ کر دیا یہاں تمہارے پاس جو تیار بنتے بنتے کہیں جو تیار کھا بیٹھے گا۔"

پھر انہوں نے ایک موچی کی لڑکی کا نام بھی لے دیا اور یہ حامی بھی بھر لی کہ وہ خود جا کر اس سے بات کریں گے۔

اللہ بخش کی شادی پر نہ ڈھول بیجے نہ شہنائی گوئی۔ گامی شور چائی اور ناچتی پھری اور یوں پانچ دن رونق میں گزرے۔ چھٹے روز گامی دہن کے ہاتھ منہ دھلا کر مہندی کارنگ چکانے کے لیے اس کے ہاتھوں کو گھی سے چپڑی تھی تو اوپر سے اس کا شوہر آگیا۔ بات گھی کو پانی کی طرح بہانے سے چلی اور اللہ بخش کو گھر سے نکال دینے پر ختم ہوئی۔ جب اللہ بخش سر پر بکس اور بستر رکھے اور اس کی نئی نویلی دہن گھنہری

اٹھائے اس گھر سے لگئے تو گامی نے دروازے پر کھڑے ہو کر دو ہتھروں سے اپنے شوہر کا ماتم کیا اور ”میرے دیر، میرے دیر“ چلاتی ہوئی بے ہوش ہو گئی۔

پہلے روز اللہ بخش اپنی بیہن سمیت ملک کرم الہی کے مہمان خانے میں رہا۔ دوسرا دن ایک کسان کے گھر آبسا۔ جب سے اسے اب تک وہ پندرہ بیس مکان بدل چکا تھا۔ اس کے سات پچھے بھی ہو گئے تھے۔ اس کی کنپیوں میں بھی ایک آدھ سفید بال نظر آنے لگا تھا مگر وہ اس تمام دوران میں اپنا مکان نہ بنو سکا۔ وہ علاقے کا مشہور مسجدی تھا۔ پہنچنے پر طله چڑھاتا تھا تو یقین نہیں آتا تھا کہ انسان کی انگلیاں اتنا باریک کام بھی کر سکتی ہیں۔ پھر اس کے جوتے کی دیتہ بھی بڑی مناسب ہوتی تھی اور آس پاس کے گاؤں کے سب کھاتے پیتے لوگ اس کے ہاتھوں کا بنا ہوا جوتا بڑے فخر سے پہنچتے تھے۔ یوں اس کی آمدی خاصی معقول تھی، مگر ادھر قم آتی تو ادھر وہ بزاں کی دکان میں گھس جاتا اور بیوی بچوں اور خود اپنے لیے ایسے کپڑے خریدتا کہ ملک کرم الہی تک سارے گھر کے لیے ایسا کپڑا خریدنے سے پہلے وہ بار سوچتا پڑتا ہو گا۔ اچھا بابا اللہ بخش کی کمزوری تھی۔ وہ جب لیڈی ہمیشہ کا تہذیب باندھ کر زوکی کی قیمیں پہن کر اور سر پر رسمی مشہدی انگلی سجا کر منگلی سے چڑھے کوکوتیا گھٹنے پر پنار کھکھل کر طله چڑھاتا تو اسے دیکھ کر لوگ کہتے ”اے مزا کیا آتا ہے اتنا قیمتی لباس پہن کر۔“

سارا دن تو ایک جگہ بیٹھا رہتا ہے!“ مگر اللہ بخش یہ باتیں سن کر جی ہی جی میں ہستا تھا اور شام کو بھاگی سے باتیں کرتے ہوئے کہتا تھا ”جیسے موچی کو دو کان میں کام کرنا ہو تو اسے کپڑے اتنا دینے چاہیں۔“

اپنے مکان کی تعمیر سے وہ غافل نہیں تھا۔ کتنی بار میاں بیوی نے اسے مسلسلے پر باتیں کی تھیں اور ملک کرم الہی کے مشورے کے مطابق تہبیہ کیا تھا کہ اب کے وہ کوڑی کوڑی بچا بھیں گے اور اپنے بزرگوں کے کھوڑ کو آباد کریں گے۔ مگر جو نبی اللہ بخش کے پاس رقم آتی، اس کی انگلیوں میں چل سی ہونے لگتی۔ وہ کہتا ”تیرے لیے چکن کی پیمنی ضرور آنی چاہیے۔“ اور بھاگی بھی کہتی۔ ”لے آ۔ تیری مرضی۔ اب میں تجھے سے کیا کہوں۔“ یوں مکان بنائے کی تو بت کبھی نہ آئی اور ملک کرم الہی نے تو مایوسی کے عالم میں چوپال پر اعلان کر دیا تھا کہ ”جس دن بیکو اپنا مکان بنائے گا اس دن قیامت آئے گی؛ دیکھ لیتا۔“

”شرم کرو بیٹکو۔“ وہ اللہ بخش کے ہاں جر کر بھی کہہ آئے ”علاقے کے اتنے بڑے کاریگر ہو ہر سال ڈھائی تین سو کما لیتے ہو، مگر سر چھپانے کے لیے پھونس کا ایک چھپر بھی نہیں بن سکتے۔ کبھی ایک کے گھر میں، کبھی دوسرے کی چوکھت پر۔ شرم کرو۔“ انہوں نے لباس کے سلسلے میں اللہ بخش کی فضول خرچی کا ذکر کبھی نہ کیا۔ ان کے ذہن میں وہی ذر تھا کہ اگر وہ انہیں اس بات پر لوگ بیٹھنے تو میاں بیوی نہیں گے اور کہیں گے ”ملک بیچا رہ جل گیا ہے۔“

برس دو برس بعد کی بات ہے۔ ایک شام اللہ بخش چوپال پر گیا اور ملک کرم الہی کے پلنگ کے پائے سے لگ کر بیٹھ گیا۔ اس کے اندر

بٹکو؟

”جی خدا یا رب تین مہینے کے لیے تحمل چلا گیا ہے۔“ اللہ بخش بولا۔ ”وہیں پڑا ہوں۔“

”اور اگر وہ کل ہی واپس آگئیا؟“ ملک صاحب نے پوچھا۔ ”تو؟“

الله بخش خاموش رہا تو ملک صاحب بولے ”شرم کرو بٹکو شرم کرو۔“

وہ اسے حسب عادت برا بجلاء کہہ رہے تھے۔ جب اللہ بخش نے ان کے گھنٹے کو چھوڑا اور بولا ”اللگ سے ایک بات کرنی ہے۔“

”یہیں مانگ تو کتنے روپے چاہیں؟ ملک کرم الہی بولے“ لیکن شرم کرو بٹکو۔

”جی نہیں، وہ بولا“ ایک اور کام ہے۔“

”اچھا!“ ملک صاحب نے پاؤں نکلا کر جوتا پہنا اور اندر چوپال کے کوٹھے میں چلے گئے۔ اللہ بخش نے ریشمی تہہ کرایک ”لڑ“ کھول کر اس میں سے فتوؤں کا ایک پاندہ نکالا اور بولا ”یہ تین سوروپے اپنے پاس امانت رکھ لیں۔“

اگلے سال ڈھیری والے ملک نور گنگ کے بیٹھے شادی ہے۔ اکٹھے میں ”طلے گج“ جوڑوں کا کہا ہے۔ یہ تین سوروپے بٹکلی ہیں۔ میں نے کہا آپ کے پاس رکھ دوں۔ کچھ اور جمع ہو جائے تو مکان بنواؤں گا۔“

”بسم اللہ۔“ ملک کرم الہی نے روپے لے لیے۔ وہ اس زیادہ کچھ نہیں بولے۔ وہ اتنے خوش تھے کہ اس سے زیادہ بول بھی نہ سکتے تھے۔

ملک کرم الہی کے پاس یہ تین سوروپے تین سال تک جمع رہے مگر ان میں ایک روپے کا بھی اضافہ نہ ہوا کہا۔ اللہ بخش مکان بدلتا رہا۔ خالص ریشم پہنچتا رہا اور اولاد میں اضافہ کرتا رہا۔ ملک صاحب کو ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے اللہ بخش ان کے پاس تین سوروپے جمع کر کے ان کی زبان کاٹ لے گیا ہے۔ وہ جوچھے تین سال میں ایک بار بھی اپنا مکتب کلام استعمال نہیں کر پائے تھے۔ اس اتنا کیا کہ جب اپنے بیٹھے اور بیٹھی کی شادی پر انہوں نے اللہ بخش سے جوڑے بنو لیے اور اللہ بخش ان سے اجرت وصول کرنے آیا تو انہوں نے کہہ دیا۔ ”جانہیں دیتے۔“ پھر وہ بولے ”دو سو کی یہ رقم میں نے تمہارے تین سو میں جمع کر دی ہے۔ اب تمہارے پانچ سو ہو گئے۔ چار پانچ سو اور جمع کر لو تو اکٹھے دے دوں گا۔“ مگر اس شرط پر کہ تم فوراً مکان بنوانا شروع کر دو گے۔ ..... جاؤ۔“

کوئی ہفتہ بھر بعد اللہ بخش ملک کرم الہی کے پاس سوروپے لے آیا اور اپنے پانچ سو واپس مانگتے ہوئے اس نے بتایا کہ اس نے مکان

کی تیاری شروع کر دی ہے اور کل ہی سے اینٹوں کی ڈھوائی ہونے لگے گی۔

"اینٹوں کی ڈھوائی؟" ملک کرم الہی حیران رہ گئے۔ " دروازوں، گھر کیوں کی پکی ڈاٹ کے لیے تو یہی کوئی سود و سوائیٹ چاہیے۔" جی میں پکا مکان بناؤں گا۔" اللہ بخش بولا" چار دن کی زندگی ہے۔ پھر عمر بھر بھیک کریم ٹھکانہ بناؤں گا تو پکا کیوں نہ ہو۔ سود و سو تین سو زیادہ لگ گئے تو کوئی حرج نہیں۔ ملک فتح علی کے دونوں بیٹوں کی اکٹھی شادی ہو رہی ہے اگلے کاتک میں۔ سارے کام ہو جائیں گے۔"

ملک صاحب نے زبیدہ، حفیظ اور الطاف کے ناموں سے لے کر اللہ بخش کے ریشمی کپڑوں تک اپنے اندر جو لا دا جمع کر رکھا تھا وہ بھانے بھانے سے اگل دیا۔ بولے "بڑا ماغ ہے تمہارا۔ موچی ہو کر اولاد کے نام لا ہو ریوں کے سے رکھتے ہو۔ موچی ہو کر ریشم پہننے ہو۔ اب موچی ہو کر پکا مکان بنواتے ہو۔ میں پوچھتا ہوں، علاقے بھر میں کسی بڑے سے بڑے موچی کا بھی مکان پکا ہے؟ پھر کیا تم نے اتنے روپے جمع کر لیے ہیں؟ یہ ایک ہزار تو بنیادوں کی اساری پر اٹھ جائیں گے۔"

"بسم اللہ تو کروں ملک جی۔" اللہ بخش بولا۔ "خدا برکت دے گا۔"

"مگر اپنے باب دادا کی طرح تم کچھ کوٹھے میں رہو گے تو کیا تمہارا دم گھٹ جائے گا؟" ملک صاحب کا لہجہ سخت ہو گیا۔ اللہ بخش بولا "صرف بڑے لوگ تو پکے مکان اپنے نام لکھوا کر نہیں آئے ملک جی۔" یکا یک وہ اپنے لہجے سے چونکا اور ہاتھ ملنے لگا۔ "وہ میں نے عرض کیا ہے کہ چار دن کی زندگی ہے۔ موچی ہوں پر کہا تا کہا تا ہوں۔ اب پھلا اور لٹو بھی ہاتھ بٹانے لگے ہیں۔ پھلا تو ملک جی،" پر ایسے ایسے نیل بولے کاڑھتا ہے کہ موتی پر ودیتا ہے۔ اللہ کرے گا سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

پھر ذرا مسکرا کر بولا۔ "آپ کی موجودن تو کہہ رہی تھی کہ مکان کی چھت پر چمنی بھی رکھیں گے جس میں سے بڑے لوگوں کے گھروں کے طرح صاحب دھواں بھی لٹکے گا۔" ذرا سارکر بچوں کی طرح یوں بولا جیسے ملک صاحب پر کوئی اکشاف کر رہا ہے "کچھ گھروں کا دھواں تو دروازوں میں سے نکلتا ہے۔"

ملک کرم الہی نے اسے پانچ سوروپے تو لا کر دے دیے مگر ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ "بٹکو میری سن، کچا مکان بنوائے۔ پکے لے لیے تو کپی آمدی چاہیے۔ اور اب تو بونوں گرگا یوں کا زمانہ شروع ہو چکا ہے۔ یہ نہ ہو کہ آدمی آدمی دیواریں اٹھا کر پیٹھے رہ جاؤ۔"

"نہیں ملک جی،" اللہ بخش بولا۔ "آپ دیکھئے تو سہی دروازوں پر سست گئے گا۔ چھت پر شہتیر کی جگہ گارڈر چڑھاؤں گا۔ سلاخوں والی باریاں ہوں گی۔ روغن والے دروازے ہوں گے۔ آپ دیکھئے تو سہی ملک جی! اور ہرگلی کی طرف کونے میں دکان بنے گی۔ وہ بھی پکی ہو گی۔"

”دکان پکی ہوگی؟“

”جی ہاں۔ سب پکا ہوگا۔ پھر میں لاگل پورا لہور جا کر نئے نئے اوزار لاوں گا۔ ہاتھی دانت کے ستون والے اوزار۔ اور جس دن سب کچھ ہو جائے گا اس دن آپ کو بلاوں کا کہ میرے گھر میں آ کر میرے سر پر ہاتھ پھیر دیجئے۔“

”خدا تجھے برکت دے بٹکو۔“ ملک کرم الہی جیسے نوتے ہوئے نشے کے عالم میں بولے۔ ”مگر اس تیرے شیش محل سے کامکان کیا برا تھا؟ اوپر سے تو کچا ہوتا ہے پر میں نے دیکھا ہے کہ کچے سے زیادہ ہوتا ہے۔“

”نہیں ملک جی۔“ اللہ بخش نے کہنا چاہا مگر زبان کو بند داتوں کے پیچھے دبا کر رہ گیا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ ”ملک جی! اللہ اکھدر سے زیادہ ہوتا ہے۔ ریشم لٹھے سے زیادہ ہوتا ہے۔ زیادہ رو پیکم رو پے سے زیادہ ہوتا ہے۔ اسی طرح پکامکان کچے سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ اپنے ابا کامکان دیکھ لجھے اور میرے ابا کامکان دیکھ لجھے۔ وہ صرف اتنا کہہ پایا کہ ”بس جی چاہتا ہے۔ پچے کیا یاد کریں گے۔“

”تیری مرضی۔“ ملک صاحب نے کہا۔ جیسے وہ اللہ بخش کو خود کشی سے روکنے میں ناکام رہے ہوں۔

اللہ بخش کامکان بننا شروع ہوا تو گاؤں کے اس حصے میں ایسی چھپل پہل نظر آنے لگی کہ بڑے بڑوں کی حوالیوں کی تعمیر میں بھی نظر نہیں آئی۔ لکڑی کی گلیوں کے ڈھیر لگ رہے ہیں جس سے دروازے اور کھڑکیاں اور پڑھتیاں اور الماریاں تک بنائی جا رہی ہیں۔ لوہے کے اکٹھے چار گاؤڑا آرہے ہیں۔ سینٹ اور چوکور آئینے لائے جا رہے ہیں۔ دروازوں، کھڑکیوں اور الماریوں کے لیے تابے اور چینی کی دستیاں خریدی جا رہی ہیں۔ تین کوھوں کے سامنے ایک لمبا سابر آمدہ بن رہا ہے۔ تیرے کوٹھے میں آتش دان تیار ہو رہا ہے جس کی چمنی اتنی اوپنجی ہے جیسے چھت پر اللہ بخش کھڑا ہے۔ پھر ادھر دکان کے فرش کو سینٹ سے پختہ کیا جا رہا ہے اور اس کی الماریوں میں رنگیں شیشے لگ رہے ہیں۔ سلیمانی سینٹ کی درزوں میں نیلے رنگ کے حاشیے کھینچ جا رہے ہیں۔ ایک طرف ”کھرا“ بن رہا ہے کہ کبھی کبھی گھر میں بھی نہ لینے کو جی چاہتا ہے۔ حدیہ ہے کہ پردہ دار گھروں کی ہی پختہ چار دیواری بن رہی ہے اور ایک جگہ لٹکش و نگار اور شیشی رنگ کے روغن والا بڑا دروازہ لگایا جا رہا ہے کہ اونٹ بھی چاہے تو ذرا سا جھک کر گزر جائے۔

اللہ بخش کامکان صرف اسی گاؤں ہی کا نہیں سارے علاقوں کا موضوع گفتگو بن گیا تھا۔ اس کے دو سبب تھے۔ ایک تو یہ کہ دھرتی کے ”منہ پر یہ پہلا مکان تھا جسے ایک موچی بنوار ہاتھا اور دوسرا یہ کہ اللہ بخش اب تک گیارہ بارہ ہزار روپے خرچ کر چکا تھا۔ ملک کرم الہی جانتا تھا کہ جس روز اللہ بخش نے ان سے پانچ سو کی امانت واپس لی تھی اس روز سے اس نے ایک جوتا بھی نہیں بنایا تھا۔ وہ دن بھر تعمیر کر گئی کرتا۔ مسٹر یوں اور مزدوروں کی ”پچھا نیں“ کے لیے گھر سے تازہ تازہ مرونڈے بنالاتا۔ سامان کی حفاظت کے لیے رات وہیں صحن میں گزارتا اور صبح کو نماز سے فارغ ہوتے ہی مسٹر یوں مزدوروں کو جمع کرنے میں لگ جاتا۔

ملک کرم الہی نے ایک دوستریوں سے بھی پوچھا۔ معلوم ہوا کہ انہیں اپنے کام کی اجرت باقاعدہ ہر شام کوں جاتی ہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اللہ بخش کو یہا کیک آتی بہت سی دولت کیسے ہاتھ لگ گئی ہے۔ اس کا یہ بھی چاہا کہ اللہ بخش سے پوچھ لیں۔ مگر اللہ بخش کا یہ فقرہ ان کے ذہن میں کھونئے کی طرح گڑا ہوا تھا کہ ”صرف بڑے لوگ ہی تو کہ مکان اپنے نام لکھوا کر نہیں لائے ملک جی۔“ کتنی دفعہ چوپال پر بھی اللہ بخش کے مکان کی بات چلی مگر بڑھنے سکی۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے لوگوں کو اس مسئلے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے اور اگر ایک موچی پکا مکان بنوار ہاہے تو بنوایا پھرے۔ آخر کوئی کیا کر سکتا ہے۔

جس روز مکان کی آخری درز پر بھی سینٹ لگ گئی اور اس میں نیلا حاشیہ کھد دیا، تو مستریوں، مزدوروں اور تماشاجوں نے اللہ بخش کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور اس پر ”مبارک ہو“ کا مینہ بر سادیا۔ اللہ بخش اس وقت کمر کے دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور کچھ دیر تک یوں ہی بیٹھا رہا۔ اس دوران میں بھاگی گڑا اور بتائے باقی پھری اور اللہ بخش اور بھاگی کے بچے بڑے دروازے پر یوں بے تاب کھڑے نظر آئے جیسے بس نہیں چل رہا اور نہ مکان کو سر پر اٹھا کر گلی گلی لیے پھرتے۔ اسی دوران ملک کرم الہی آنکھ اور اس کے پاس آ کر بولے۔ ”مبارک ہو بھکو۔“ اللہ بخش نے ہاتھ چھرے پر سے ہٹائے تو لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ رورہا ہے۔

”روکیوں رہے ہو؟“ ملک کرم الہی نے پوچھا۔ پھر لوگوں سے مخاطب ہوتے ہوئے مسکرائے اور بولے ”اتنا خوش ہوا ہے کہ رو رہا ہے۔“ پھر وہ چلے گئے۔ آہتہ آہتہ سب لوگ چلے گئے۔ پھر اللہ بخش بھی اپنی بیوی بچوں سمیت چلا گیا اور شام سے کچھ دیر پہلے سب سروں پر سامان لادے اپنے کپے مکان میں واپس آگئے۔

بچے صحن میں اینٹوں کے فرش پر ناچنے کو دئے گرنے اور رونے لگے اور اللہ بخش بیوی اور بڑے بچوں کو مکان کی حفاظت کرنے اور اس کی خوبصورتی کو قائم رکھنے کے گر سمجھاتا رہا۔ اس نے بتایا کہ اتنے اچھے مکان میں چکھے ہوئے صندوق جھولتے ہوئے کھٹو لے اور پھوسڑے نکلے لاف بھلنے ہیں لگتے اس لیے یہ سب کچھ بدلا جائے گا۔ ساتھ ہی مٹی اور تام چینی کے برتوں نے آتش دان والے کرے کی فرش کا ناس مار دیا تھا مگر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آہتہ آہتہ ٹھیک ہو جائے گا۔ میرے دو گھبرو بچے میرے یہ بازو سلامت رہیں۔ سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔“

”ہائے میں تو سوچتی ہوں مجھے نیند کیسے آئے گی اس شیش محل میں۔“ بھاگی نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں گاڑ کر اور انگوٹھوں سے اپنی ٹھوڑی کرپڑتے ہوئے کہا۔ پھر وہ ہنسنے لگی۔ مگر ایک دم چپ ہو گئی اللہ بخش رورہا تھا۔

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ یہا کیک چار دیواری کا بڑا دروازہ کھلا اور گامی مٹی کے جلتے ہوئے ایک چراغ کی لوکو اپنے ایک ہاتھ کے حصہ میں لیے داخل ہوئی۔ بچوں نے ”پھوپھی پھوپھی“ کا شور مچا دیا۔ بھاگی نے آگے بڑھ کر گامی سے چراغ لینا چاہا مگر وہ بولی ”میں تو اپنے دیر

کے شیش محل میں اپنے ہاتھ سے چراغ بجاوں گی۔ ”وَبِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ كہہ کر اندر گئی۔ ایک کھلی کھڑکی میں چراغ رکھ دیا اور پھر چاروں دیواروں کو چوم کر باہر آئی تو بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”ہائے آج میری ماں ہوتی۔ ہائے آج میرا باپ ہوتا۔ دنیا آج جل رہی ہے پر وہ لکنے خوش ہوتے۔ ہائے وہ لکنے خوش ہوتے۔ ”وہ زار زار رو نے لگی۔ پھر آنسو پوچھتے ہوئے بولی۔ ”میرا ویر کہاں ہے؟“

اللہ بخش دیوار سے لگ کر کھڑا تھا۔ چراغ کی روشنی میں آگیا تو گامی اس سے پٹ گئی اور بولی۔ ”میرے ویر! میں تو اپنے چراغ کے سو روپے لوں گی اور ابھی اسی ہاتھ پر لوں گی۔ میں نے جب اپنے بھروالے سے کہا کہ میں اپنے ویر کے شیش محل میں چراغ جلانے کے سو روپے لینے جا رہی ہوں تو کتیا کا جناہ بننے لگا۔ کہنے لگا سو آنے ہی لے آتے انوں۔ ان کے بھی سو چھروپے بنتے ہیں۔ وہ سب کو اپنے جیسا سمجھتا ہے کہ جوں مکھی چوں۔ لا میرے ویر اپنی بہن کا حصہ۔“

”میں اپنی بہن کو سوروپے دوں گا۔“ اللہ بخش بولا۔ ”کیوں نہیں دوں گا؟“

”تو پھر لا جلدی سے۔“ گامی اب خوشی سے رورہی تھی۔ ”میں تو یہ سوروپے گاؤں کی گلی گلی میں نجاتی ہوئی جاؤں گی اور کہوں گی، ایسے ہوتے ہیں بہنوں کے ویر۔ جو شیش محل بنو سکتے ہیں، وہ سوروپے بھی دے سکتے ہیں۔ لا میرے ویر۔“

اللہ بخش چپ چاپ کھڑا اپنی بہن کی پھیلی ہوئی تھیلی کو دیکھتا رہا، پھر بولا۔ ”ذراییش جا گامی! میں ابھی لاتا ہوں۔ میں نے روپے ایک اور جگہ رکھے ہوئے ہیں۔“

میں تو یہاں تیرے انتظار میں قیامت تک بیٹھی رہوں گی۔ ”گامی نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے خالی ہاتھ گھر جا کر کیا جو تے کھانے ہیں؟ تو لے آ۔ جب تک بھر جائی سے باقیں کروں گی۔“

اللہ بخش جانے لگا۔ پھر پلٹ کر آیا اور بولا ”گامی! تو برانہ مانے تو چراغ کھڑکی سے ہٹا لوں۔ اس کی لوکھڑکی کی ڈاٹ کو کالا کردے گی۔“

”ہائے میں غریب کیا جانوں۔“ گامی ہڑ بڑا کر اٹھی اور اندر بھاگی۔ پھر چراغ اٹھاتے ہوئے جھک کر ڈاٹ کو دیکھا اور بولی۔ ”ہائے جمع کچھ نشان پڑ بھی گیا ہے۔ ہائے میری آنکھیں پھوٹیں۔ مجھے کیا پڑ کر پکے مکانوں میں چراغ کہاں جلتا ہے۔“ اس نے چراغ کو مکان کے وسط میں فرش پر رکھ دیا۔ ”یہاں تو صحیک ہے نا؟“ اس نے اللہ بخش سے پوچھا۔ ”میں اسے بجھاؤں گی نہیں۔ تیل ختم ہو گا تو خود بخوبی جائے گا اور تیل پوری رات ختم نہیں ہو گا۔ میں تو پانچ پیسے کے تیل سے بھروvalے کے لائی ہوں۔ جا میرے ویر جلدی سے میرے روپے لے آ۔“

اللہ بخش چلا گیا۔

گامی نے آدمی رات تک اس کا انتظار کیا اور پھر روتی ہوئی انٹھ کر چلی گئی۔

اللہ بخش کی بیوی نے صبح تک اپنے شوہر کا انتظار کیا اور پھر پینے بینچے گئی۔

اللہ بخش آج چھ سال سے گاؤں میں نہیں آیا۔

اس کے شیش محل میں تالائیک رہا ہے۔ چھ توں پر ہاتھ ہاتھ بھر گھاس اگ آتی ہے۔ صحن میں اینہوں کے فرش میں سے بھی پودے نکل آتے ہیں اور دروازوں کا نیلا حاشیہ روتنی ہوئی آنکھوں کے کا جل کی طرح بہہ کر پھیل گیا ہے۔

اللہ بخش ان دنوں لاہور میں ہے۔ وہ پکھری روڑ پر چیلے اور لطوسیت بونیورٹی کے طلباء کے جو تھا اور پاش کرتا ہے اور اس کی بیوی مصری شاہ میں ایک پکے مکان سے ملخت نوکروں کی کچی کوٹھڑی میں بیٹھی بچے پالتی رہتی ہے۔ اللہ بخش اور اس کے بینے دن میں چھ سات روپے کا لیتے ہیں مگر وہ ہر روز پانچ روپے الگ رکھ دیتا ہے اور ہر میئنے ڈیڑھ سو کامنی آڑ راپنے گاؤں کے کسی نہ کسی کھاتے پتے آدمی کے نام بھجوادیتا ہے۔ جب منی آڑ رجھ جو کر آتا ہے بھاگی کو ایک ہی بات سمجھاتا ہے۔ ”رمت بھاگی۔ یہ روپیہ ان لوگوں کو جارہا ہے جن سے میں اپنے مکان کے لیے قرض لیتا تھا اور انہیں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی قسم دیتا تھا کہ میری ناک کا معاملہ ہے، کسی کو بتائیں نہیں۔ وہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں آنکھیں بھی نہ اٹھا کوں۔ اگر اس دن ملک کرم الہی مجھے گامی کے لیے سورہ پے دے دیتا تو میں دس ہزار کا قرض یوں چلکیوں میں اتار دیتا۔ میں سیدھا اس کے پاس چلا گیا کہ اس سے میں نے مکان کے لیے قرض نہیں مانگا تھا۔ اس نے قرض بھی نہ دیا اور بھری چوپال میں آ کر یہ بھی کہدیا کہ ”اب راز کھلا ہے بلکو کے پکے مکان کا۔ یہ کم بخت تو اور ادھر سے قرض لیتا رہا ہے۔ تم میں سے اسے کس کس نے قرض دیا ہے بھی لوگوں؟ اور بھاگی؟ آفرین ہے لوگوں پر کہ ان میں سے ایک بھی نہ بولا۔ میرے پینے نکل گئے پر کوئی ایک بھی نہ بولا۔ سب اپنے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی قسم پر قائم رہے۔ ملک ان سے بار بار پوچھتا رہا اور میں اس کی چوپال سے چلا آیا۔ میں گاؤں ہی سے چلا آیا۔ میں لاہور چلا آیا۔ پھر تم لوگوں کو بھی بلوا بھیجا۔ اب بس کل سات سو باقی ہیں۔ دو سو میری گامی بہن کے اور پانچ سو ملک گل باز کے۔ ملک گل باز کو میں نے چھپی لکھی تھی۔ اس نے جواب دیا تھا کہ بے شک مجھے سب سے آخر میں دینا اور لکھا تھا کہ آکر مکان تو دیکھ جاؤ۔ پانچ چھ سال سے بند پڑا ہے۔ میں نے چھپی لکھی کہ اب اکٹھے ہی آئیں گے۔ قرض پورا ہو جائے تو سیدھی گاؤں کی راہ لیں گے اور اپنے مکان کی چھت پر چڑھ کر پکار کر ملک کرم الہی سے کہیں گے ”ملک جی یوں بختم ہیں پکے مکان اور یوں رہتے ہیں پکے مکانوں میں۔“

بھاگی نے کہا ”ملک تو پھر بھی کہہ گا کہ شرم کرو بلکو شرم کرو۔“

”تو میں کہوں گا۔“ اللہ بخش بولا۔ ”میں کہوں گا۔ ملک جی! اب شرم کا ہے کی کروں۔ اب تو میرا شیش محل اپنا شیش محل ہے۔“



# بھرم

ڈوبتا ہوا سورج ایک بدلتی سے چھو گیا۔ شام کو آگ لگ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شفق بدلتی میں سانہیں سکی اس لیے چھلک پڑی ہے۔ شہر کی عمارتوں، درختوں، سڑکوں، بوسوں اور موڑوں، شہر یوں کے لباسوں اور ان کے چہروں اس ایک لمحے کے موقعم نے شفق کے شعلے کا رنگ چھیر دیا تھا۔ ہماری کار جب حمید کے ہنگلے میں داخل ہوئی تو عرقان بولا ”دیکھو دیکھو لوگو ارنگ تو دیکھو حمید کے ہنگلے کا۔“ اس نے کار بہت آہستہ کر لی اور اپنے خاص انداز میں تھہر تھہر کر اور مزے لے لے کر بولنے لگا۔

وہ ہوش میں یوں بولتا تھا جیسے لوگ شراب پی کو بولتے ہیں۔ شراب پی کرتے وہ بہت کم بولتا کہ یہ ڈوبتے ہوئے سورج کی شرارت ہے تو میں یہ سمجھ کر کار کر بیک کر کے لے جاتا کہ ہم کسی غلط ہنگلے میں آگئے ہیں۔ حمید کے ہنگلے کا رنگ تو زس کے لباس کی طرح سفید ہے اور ہم جس ہنگلے میں داخل ہو رہے ہیں وہ تو شرمائی ہوئی لڑکی کے گالوں کی طرح گلابی ہو رہا ہے۔ دیکھو دیکھو ورانہ میں سے اترتی ہوئی مسز حمید کو دیکھو۔ کیسی لگ رہی ہیں؟“

”سلئے دی لاث ورگی۔“ شہید بے ساختہ بولا۔

عرقان اور میں نے زور کا قہقہہ لگایا۔ شہید مکرا تارہ اور رب نواز چپ چاپ بیٹھاونڈ سکرین سے پار یوں دیکھتا رہا جیسے وہ طیارے میں سوار ہے اور طیارہ بادلوں میں سے گزر رہا ہے۔ عرقان نے کار روک لی اور مسز حمید بولیں۔ ”کوئی لطیفہ ہو گیا کیا؟“

شہید بے تکلف یعنی پھٹ آدمی ہے۔ اس لیے میں اس ڈر سے کہ کہیں وہ پنجابی ”بولی“ کو دہرانہ دے فوراً بولنے لگا۔ شہید کہہ رہا ہے کہ جنت کی دیواروں پر دوزخ کے شعلوں کی چمک اسی طرح ناچھی ہو گی۔ جیسے اس وقت شفق نے آپ کے ہنگلے“

مگر میرے فقرہ پورا کرنے سے پہلے ہی مسز حمید نے تالی بھادی۔ وہ زور کا قہقہہ لگانے سے پہلے ہمیشہ تالی بھاتی ہیں۔ اس لیے انہوں نے تالی بھائی اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے دونوں گھنٹوں میں دبا کر ہنسنے لگیں اور ان کے لبے بال جنمیں ایک رہن نے ان کی پیٹ پر سمیث رکھا تھا ان کے شانوں پر بکھر بکھر گئے۔

اتئے میں حمید بھی بھاگتا ہوا آپنچا۔ وہ گیلا گیلا سالگ رہا تھا۔ شاید نہا کر نکلا تھا۔ اس نے آتے ہی ہم سے مصافحہ کرنے کی بجائے رب نواز کے پاس جا کر اس کی لمبی ناک مرزوڑی۔

رب نواز ہمارا فلسفی دوست ہے۔ وہ گھنٹوں کچھ نہیں بولتا۔ اور جب وہ نہیں بولتا تو کم سے کم میں نے ہمیشہ یہ سوچا ہے کہ اگر اس کو من

کھو لے جائے تو اس کی زبان پچھوندی سے سفید ہو رہی ہوگی۔

البتہ جی بھر کے شراب پی لینے کے بعد جب وہ بولنے پر آتا ہے تو چاہے آپ اکتا کر بے آواز بلند اور باجماعت جما ہیوں پر جما ہیوں لیں، وہ بولتا چلا جاتا ہے۔ (یعنی وہ اس معاملے میں عرفان کے بالکل الٹ ہے۔) ویسے گفتگو میں خواتین بھی شامل ہوں تو وہ انہیں قدم قدم پر بولنے کا موقع دیتا رہتا ہے اور انہیں منون کر کے بہت خوش ہوتا ہے۔ اس وقت وہ عرفان کی کار میں پچھلی سیٹ پر میرے پاس ہی بیٹھا تھا۔ مگر جب سے بیٹھا تھا، اس بیٹھا تھا۔ دوستوں کا دوست تھا اس لیے سب اسے برداشت کرتے آ رہے تھے۔ مگر اج اتنی چمکتی ہوئی رنگیں شام میں اس کی خاموشی مجھے تو زہر لگ رہی تھی۔ میں نے رستے میں ایک بار اس سے کہا بھی کہ الوصاہب آپ بھی تو کچھ بولیے۔ ”گلووہ الوں کی طرح میری طرف دیکھنے لگا تھا۔ اور شہید نے یہ کہہ کر اسے خارج از بحث کر دیا تھا کہ ”ا تو صرف رات کو بولنے ہیں۔“

حمدی نے رب نواز کی ناک مردوڑی تو وہ چلا یا۔ ”ہیں! کیا بنکوانس ہیں؟“

اور شہید کو لمبیں کی طرح اچھل کر بولا ”یار و مجنہ نواز کی آواز سنائی دے رہی ہے!“

ہم ہنس رہے تھے تو ایک دم جیسے کسی مشین کا بیشن دب گیا اور ہمارے سروں پر پھیلے ہوئے پیپل کی شاخوں میں سینکڑوں چریاں دن کا ماتم کرنے لگیں۔ کسی نے جیسے پھونک مار کر سورج کو بچھا دیا۔ بدلتی جو شفق سے جل اٹھی تھی رکھ ہو گئی۔ ہنگلے کا رنگ سرمی سا ہو گیا اور دور کسی مسجد میں لاڈ پسکر پر کوئی اذان دینے لگا۔

برآمدے میں آ کر حمید بولا۔ ”سور و اتم سے کس نے کہا تھا کہ شام سے پہلی ہی میرے گھر آؤ جمکو۔ یہ گم سے پوچھ لو کہ خاص مہمان کے آنے میں ابھی کم سے کم ایک گھنٹہ باقی ہے اور تم جانتے ہو خالد وقت کا کتنا پابند ہے۔ اب تم آگئے ہو تو ظاہر ہے کہ بیٹھ کر چھت کی کڑیاں نہیں گنو گے بلکہ میری دسکلی پر جھپٹو گے جو میں نے جانے کس کے پر مٹ مانگ تا نگ اور جھین جھپٹ کر جمع کی ہے اور اگر خدا نخواستہ آج رب نواز بھی پینے کے موڈ میں ہوا تو کیوں نواز اتم تو نہیں پیو گے؟“

”پیوں گا۔“ رب نواز بیلی کی میاں کے سے لبھے میں بولا۔

اور حمید کو عرفان اور شہید اور میں نے بڑی مشکلوں سے تھاما جو صدمے سے بے ہوش ہونے کے لیے ایک آرام کری پر گرنے جا رہا تھا۔

یہ گم حمید میرے پاس آ کر بولیں ”کیوں رحیم صاحب! کہیں آپ بھی تو نہیں پینے لگے؟“

میں نے کہا ”برسون تک بندہ ان شیطانوں کی صحبت بد کے اثرات سے محفوظ رہا ہے لیکن دیر تک گندی صحبت میں رہنے سے انسان انسان سے زیادہ خربوزہ بن جاتا ہے اور بزرگ کہے گئے ہیں کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔“

”بائے اللہ! تو آپ بھی پینے لگے“ حمید نے دونوں ہاتھ اپنے دونوں کولھوں پر دے مارے۔ ”بائے میں نے سوچ رکھا تھا کہ اپ آئیں گے تو آپ سے غالب کے چند اشعار بھجوں گی۔ بڑی بمحض میں ہوں۔“

”کیوں حضرت رحیم! شہید نے مجھ سے پوچھا۔ اس دوران میں رام پور کے عرشی صاحب نے غالب کی کوئی غیر مطبوعہ غزل تو نہیں پچھپوادی؟“

”اچھا تو یہ کسی چڑیا کا نام ہے؟ شہید بولا اور سب لوگ (سوائے رب نواز کے) قہقہے مارتے تالیاں بجاتے اور پاؤں پٹختے ڈرائیک روں میں آگئے۔ آخر میں رب نواز یوں داخل ہوا جیسے بکرا مزدوج میں داخل ہوتا ہے۔

شراب پینے سے پہلے رب نواز پر بھیش اسی طرح عاجزی اور خاکساری کا دورہ پڑتا ہے۔

صوفوں پر بیٹھ کر ہم ابھی بیگم حمید کے ذوق آرائش کی پوری داد بھی نہیں دے پائے تھے کہ ایک کار کے رکنے کی آواز آئی اور حمید یہ فریاد کرتا ہوا باہر پکا کہ سب کم بختوں نے وقت سے پہلے آ کر اس کی دھمکی کے سٹاک کا صفائیا کرنے اور خالد اور ثریا کے سامنے اسے شرمندہ کرنے کی سازش کر رکھی ہے۔ بیگم حمید بھی باہر چلی گئیں۔ پھر ایک اور کار کی۔ برآمدے میں باتوں سے زیادہ قہقہوں کی آواز آئے لگی۔ پھر باہر کسی خاتون کی بڑی لمبی بھنگی کی آواز آئی اور اندر شہید اپنے آس پاس اور صوفوں کے نیچے یوں دیکھنے لگا جیسے کچھ ڈھونڈ رہا ہے۔

”کیا ڈھونڈ رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”گھنگھرو کہاں گیا؟“ وہ بولا

”گھنگھرو؟“ میں نے پوچھا۔

”گھنگھرو کیسے کہیں کے؟“ عرفان نے آس پاس جھانکتے ہوئے کہا۔

”شہید بولا“ بھنگی وہی جو ابھی ابھی باہر درانڈے سے لڑک کر اندر آیا ہے۔“

ہنستی ہوئی خاتون ہنستی ہوئی اندر آئیں تو وہ بولا ”یہ جو ابھی تک نج رہا ہے۔“

”کیا نج رہا ہے؟“ خاتون نے ہنسی روک کر پوچھا۔

”گھنگھرو۔“ شہید بولا۔ اور ہماری جان نکل گئی۔

شوہر کی خود کشی کے بعد بیگم نورالہدی کو نہ جانے کیا ہوا تھا کہ دوسرے کی تو خوب خوب ہنسی اڑاتی تھیں مگر اپنے بارے میں ڈرائی بھی بھڑک اٹھتی تھیں اور ایک دوپار یوں سے تو وہ اسی بنابرداں آؤٹ بھی کر چکی تھیں۔ شہید کا جواب سن کر ہمیں یقین ہو گیا کہ خالد کی

شادی کی خوشی میں دی جانے والی اس پارٹی کا آغاز ہی تھی سے ہوگا۔

”مختصر ہو؟“ بیگم نور الہدی نے پوچھا۔ ”کہاں نج رہا ہے مختصر ہو؟“

”رب نواز کے گلے میں نج رہا ہے۔“ شہید بولا۔ اور عرفان اور میں نے اطمینان کی لمبی سانس لی۔ بیگم نور الہدی مختصر و بجا نہ لگیں اور شہید بولتا رہا۔ ”کھانے سے پہلے وہ سکی مانا تھیں ہوا اور وہ سکی کے آنے میں ذرا سی دیر ہو جائے تو رب نواز کے گلے میں موت کا مختصر و بجھ لگتا ہے۔ آپ سب ذرا سانس روک کر سنئے تو۔ مسلسل نج رہا ہے۔“

سب مکراتے ہوئے خاموش ہو گئے تو رب نواز بولا ”یہ کیا بکواس ہے؟“

”لیجھ۔“ شہید بولا۔ ”ہم مختصر و کروڑ ہے تھے اور یہاں گھریاں بنجنے لگا۔“

ایک درجن قیچیہ ایک ساتھ بلند ہوئے۔ پھر سب لوگ صوفوں میں دھنس گئے۔ بیگم حمید اور بیگم نور الہدی کے علاوہ دو خواتین اور بھی تھیں۔ ایک شیخ شفقت الہی مرحوم کی بیوہ اور دوسری ان کی لڑکی نیشن۔ میں نے نیشن کو لڑکی اس لیے کہا ہے کہ وہ ابھی تک کنواری تھی اور خواتین میں اس لیے شامل کیا ہے کہ اس عمر کی کنواریوں کو خواتین نہ کہا جائے تو کئی غلط فہمیوں کا ندیشہ پیدا ہو جاتا ہے۔

سب ایک دوسرے کو جانتے تھے اس لیے باہمی تعارف کی ضرورت نہ تھی۔ کچھ دیر تک بیگم حمید کے ذوق آرائش کی تعریف ہوتی رہی اور وہ تالی بجا بجا کر رہتی رہیں۔ پھر سب اپنے اپنے ڈرائیگ روموں میں رکھے ہوئے نوادرات کے شجرے سنانے لگے۔

مسٹر ریتلہ سچ نے بتایا کہ اس کے پاس والٹ ٹھیکن کے آٹو گراف ہیں۔ اس پر بیگم شفقت الہی بولیں۔ ”بھجی حمید صاحب! آپ سے میں نے کتنی بار کہا ہے کہ آپ اتنی اچھی اچھی گھر گنگ قسم کی پارٹیاں دیتے رہتے ہیں مگر آپ سے یہ کبھی نہ ہوا کہ وہ سکی کے ساتھ کسی ایک آدھ شاعر کا بھی انتظام کر دیتے۔ بیگم حمید تو یہ یو پر عورتوں کے پروگرام میں غالب کی غزلیں پڑھتی ہیں۔ وہی حمید صاحب کو یاددا دیا کریں۔ اور آج تو آپ نے اپنے دوست کی شادی کی تقریب میں دعوت دی ہے۔ آج کوئی شاعر و اعر ہوتا تو کوئی سہر اوہرہا ہو جاتا۔“

”کیا کروں بیگم صاحبہ!“ حمید بولا ”کوئی شاعر میرا واقف ہی نہیں۔ مجھے تو دادو بنا بھی نہیں آتا۔“

”لیجھ۔ آپ تو کمال کرتے ہیں حمید بھائی۔“ نیشن بولی۔ ”شاعر سے واقفیت میں کیا لگتا ہے۔ رقعہ بھیج دیتے کہ پارٹی ہے۔ شرب و نوش کا انتظام ہے، تشریف لائے گا۔ میں کہتی ہوں کہ آپ کسی بھی شاعر کو ایسا رقہ بھیج دیتے تو شہید صاحب اور نواز صاحب سے بھی پہلے آپ کو ڈرائیگ روم میں بیٹھا آداب عرض کرتا ملتا۔“

سب کھنک سے ہٹے۔ پھر بیگم نور الہدی سازھی کے پلوکو سینے پر کس کو پھیلاتی ہوئی بولیں۔ ”مضراب صاحب کیسے رہتے؟“

”سویٹ،“ خواتین و حضرات یک زبان ہو کر بولے۔

”ہائے سچ کہتی ہوں،“ نیشن نے کہا ”مجھے تو کسی اردو میگزین میں مضراب کا کلام نظر آجائے تو کیش اور ڈالکن نام سیداً جاتے ہیں۔“  
دیکھنے انکل عارف! اگر ان کے گھر میں فون ہو تو نیمیں سے فون کر دیجئے۔“

”ہمارے ہاں کے شاعروں کے گھروں میں فون نہیں ہوتے۔“ ایس محمد عارف بولے۔

”اور اب وہ فون لگوانے کے قابل ہو جاتے ہیں تو شاعرنہیں رہتے۔“ شہید نے وضاحت کی۔

”یہ سب کیا بکواس ہے؟ رب نواز نے احتجاج کیا۔“ شاعروں کو مارو گولی۔ بھی تھی! کچھ منگانا ہے تو منگاؤ ورنہ اجازت دو۔“

”اجازت؟ اجازت کیسی؟“ بیگم حمید چونکہ کرکھڑی ہو گئیں۔ سب نے ایک ساتھ پٹ کر رب نواز کی طرح یوں دیکھا جیسے وہ اٹھ کر جانے لگا ہے۔

”اجازت کا کیا مطلب نواز؟“ حمید نے خاصی سنجیدگی سے پوچھا۔

اور رب نواز ہی کسی صورت بنائے اسی منہماً آواز میں بولا۔

”یہی کہا گرتم وہ سکی نہیں لاتے تو میں خود جا کر فرج سے نکال لاؤں۔“

قہقهوں سے ساری محفل اوت پوت ہو گئی اور حمید پسلیوں کو دونوں ہاتھوں سے دبائے اندر بھاگ گیا۔

چند ہی لمحوں میں تپائیوں پر وہ سکی اور شیری کی بولی میں سجادی گئیں۔ بیرے گلاں اور سوڈے کی بولیں لیے حاضر ہو گئے۔ کاگ بلبل اکر اڑے اور آن کی آن میں وسیع ڈر انگ روم شراب کی بو سے بھر گیا۔ سب تین تین چار چار کی نو لویوں میں ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ کاروں کے نئے ماؤلوں، حص کی قیمتوں، لندن اور نیو یارک کی ٹرپوں اور بعض لوگوں کی شادیوں، بعض کی متوقع طلاقوں اور بعض غیر مصدق اسکینڈلوں پر یوں گفتگو ہونے لگی جیسے بعد میں سب کوں کراپنی بحث کے نتائج پر غور کرنا اور ایک رپورٹ مرتب کرنا ہے۔ صرف رب نواز چپ چاپ بیٹھا پیتا رہا اور نیشن کی طرف حیرت سے دیکھتا رہا جو دوسرا خواتین کے بر عکس شیری کے بجائے وہ سکی پی رہی تھی۔ اس کی ساری کاپلوشانے سے ڈھلک کر اس کی گود میں ڈھیر ہو گیا تھا اور بہت اوپنجی اور بہت کسی ہوئی بلا وز کے کنارے اس کے پیٹ پیٹھے اور بازوؤں کے گوشت میں ڈوب کر رہ گئے تھے۔ یہ اس کا پانچواں پیگ تھا اس لیے وہ کہہ رہی تھی۔

”مگی! آئے مگی! اب اس عمر میں تو شیری پر لعنت بھجئے اور وہ سکی بھی پچھئے۔ قسم سے آپ دو تین چیزوں کے بعد ایک دم میری ہم سن ہو جائیں گی۔“

”ماشاء اللہ کیا سن ہو گا آپ کا؟“ بیگم نور البدھی نے ایک باچھے سے مسکرا کر پوچھا۔

غمزیشن سے پہلے بیگم شفقت الہی بول پڑیں ”چھپھٹے سال اکتوبر میں اس کی بیسویں سالگرہ منائی تھی۔ اکیسویں میں پاؤں ہے۔

چکھوں میں شادی بیاہ کا سوچیں گے۔"

"شادی کے لیے کوئی عمر مقرر نہیں کی جاسکتی۔" رب نواز نے چھٹا پیگ ایک ہی ڈیک میں پینے کے بعد کہا "شادی کے لیے صرف بلوغت شرط ہے اور اس کے بعد ہونے والے میاں بیوی کی افہام و تفہیم یعنی میوچل انڈر شینڈنگ۔ یہ افہام و تفہیم سولہ سترہ برس کی عمر میں بھی ہو جائے تو اس کے بعد شادی نہ کرنا غلط ہو گا اور اگر تیس برس کی عمر میں بھی نہ ہو پائے تو شادی کرن غلط ہو گا۔ کیا خیال ہے آپ خواتین و حضرات کا؟"

"نشہ ہو رہا ہے چند کو۔" شہید بولا۔ مجھلی کی طرح پیتا ہے کم بخت۔"

پھر وہ رب نواز سے براہ راست مخاطب ہوا "تیرے فلسفے کی ایسی کی تجھی۔ ہم پیکن کہ تیری بک بک نہیں۔"

"پینا بجائے خود بے معنی ہے۔" رب نواز نے پروفیسر کی سی سنجیدگی سے کہا۔ "پینا تو ایک مقصد کا ذریعہ ہے اور مقصد یہ ہے کہ انسان زندگی کا جتنا رس نچوڑ سکتا ہے نچوڑ لے۔ کیونکہ زندگی مختصر ہے انسان فانی ہے۔ جوانی ایک اڑتے ہوئے بادل کی سایہ ہے اور خوشی کے لمحے اباہلیں ہیں۔"

"ہائے نواز صاحب! کیا بات کہہ گئے آپ؟ نیشن جوش میں اٹھ کھڑی ہوئی اور زور زور سے سانس لیتی ہوئی بولی "آپ اتنی دور کیوں بیٹھے ہیں نواز جی۔"

"یہاں آ جائیے۔" بیگم حمید نیشن کے پہلو سے اٹھ کر کہا۔

"نواز صاحب نے تو شاعروں کی کمی پوری کر دی۔" بیگم شفقت الہی نے داد دی۔

"آداب عرض کرتا ہوں۔" رب نواز ہاتھ میں گلاس لیے اٹھا۔ وہ بے ڈھنگے قدم اٹھاتا اور ہونوں پر ایک بے ڈھنگی مسکراہٹ لیے نیشن کے پاس آ بیٹھا۔ اور پھر باہر ایک موڑ کے رکنے کی آواز آئی۔

"خالد ہو گا۔" حمید بولا اور باہر لپکا۔ بیگم حمید بھی جلدی سے باہر چلی گئیں۔

"کیسی نبھر ہی ہے دونوں کی؟" بیگم نور الہدی نے جیسے سب سے پوچھا۔ "جانے کیسی کیسی سننے میں آ رہی ہیں پر مجھے تو یقین نہیں آتا۔"

"کیوں؟ کیوں یقین نہیں آتا؟ رب نواز بولا۔ جن لوگوں نے محبت کی ہے اور سوسائٹی کی عزت بھی کی ہے، انہیں تو فوراً یقین آ جاتا ہے۔ مثلاً مجھے یقین ہے کہ خالد کے متعلق جو باتیں اس کی شادی سے پہلے سننے میں آتی رہیں اور اس کی شادی کے بعد سننے میں آ رہی ہیں وہ سب حق ہیں۔ اور اگر آپ کو یقین نہیں آتا تو دو باتوں میں ایک بات ضرور ہے، یا آپ نے سوسائٹی کی عزت نہیں کی یا آپ نے محبت نہیں

کی۔"

نیکم نور الہدی کارگنگ فق ہو گیا اور وہ رونے کے قریب پہنچ گئیں مگر پھر شہید تڑپ کر بولا۔ "خبردار ہے گا خواتین و حضرات ای چند ہیں پھر سے ہمیں یہ لیشیں دلانا چاہتا ہے کہ اس نے بھی محبت کی ہے۔ حالانکہ میرا دعویٰ ہے کہ کسی عورت نے اس کے منہ پر جوتا بھی نہیں مارا۔" "تمہارے منہ پر کتنی عورتوں نے کتنے جو تے مارے ہیں؟" رب نواز چکا اور نیشن کے ساتھ پر ساتھ مار کر ہٹنے لگا۔ نیکم نور الہدی بھی گھنگھرو بجانے لگیں۔

"اس چند کو کیا معلوم کر ....." شہید کو جیسے کوئی بات سمجھی۔ "چلے نواز بھی بتا دے کہ آنکھوں کا جو سفید حصہ ہوتا ہے وہ جوان عورت کے معاٹے بالا کا نیلا رنگ کیوں اختیار کر لیتا ہے۔ میں اسے چیلنج کرتا ہوں۔ بتائیے۔"

"یعنی میں یہ بتاؤں کہ سمندر کیوں نیلا ہوتا ہے؟" رب نواز فوراً بولا اور ساری محفل کروٹ سی بدلت کر رہ گئی۔ نیشن تو تڑپ اٹھی۔ اس نے اپنا سبانگا بازو پھیلا کر رب نواز کے گلے میں سانپ کی طرح لپیٹ لیا اور سہا ہوارب نواز اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

نیکم نور الہدی کی آنکھ میں جھانگنا کا اور پھر متانت سے بولا۔ "آپ کی آنکھ میں سمندر ہے۔"

محفل چک اٹھی اور نیکم نور الہدی گھنگھرو بجانے لگیں۔

ادھر سے خالد اس کی دہن شریا اور شریا کی چھوٹی بہن عطیہ اپنے میز بانوں کے ہمراہ اندر آگئے۔ سب مرد اٹھ کھڑے ہوئے مگر رب نواز نیشن کے بازو میں جکڑا بیٹھا تھا اس لیے بیٹھا رہ گیا۔ اور خالد بولا: "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ لوگ کب سے پی رہے ہیں۔ یہ سوال مجھے ایک تو اس لیے پوچھنا پڑ رہا ہے کہ کہیں میرے حصے کی وہ سکی کا صفائیا تو نہیں ہو چکا؟ اور دوسرے اس لیے کہ آج مجھے نواز کے مزاج نہ ساز معلوم ہوتے ہیں۔ اور نیشن بی بی دکھائی دے رہی ہیں مگر معلوم نہیں ہو رہی ہیں۔"

"ارے ان کے ساتھ تو عطیہ بھی ہے ای گم نور الہدی نے ایک باچھے سے مسکرا کر شہید سے سرگوشی کی مگر شہید نے جواب میں اپنا کان کھجا لیا اور نیکم کی باچھہ سٹ کر اپنی اصلی حالت پر آگئی۔

"ویکھئے بھی خالد صاحب!" نیشن نے رب نواز پر سے بازو ہٹاتے ہوئے کہا۔ "یہ تھیک ہے کہ آپ نے تازہ تازہ شادی کی ہے لیکن اس کے باوجود آپ کو مجھ پر ذاتی حملہ کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ مجھے آج تک ایک بھی ایسی ڈریک پارٹی یاد نہیں ہے جس میں میں اپنے پاؤں سے چل کر اپنی کار سٹک نہ پہنچی ہوں۔ یہ وہ سکی شروع کرنے سے بعد کی بات کر رہی ہوں۔ اس کے مقابلے میں کیا حضور کو عرفان صاحب کے ہاں کی وہ پارٹی یاد ہے جو بھی وہ روز پہلے آپ کی شادی سے بیسی کوئی تین روز پہلے ہوئی تھی۔ اور جس میں آپ نے ان کے وہ ہزار کے ایرانی قالمین کو اگال داں بنالیا تھا؟"

بیگم نور الہدی نے اکٹھے بہت سے گھنٹھرو چھنکا دیئے اور نیگم حمید نیشن کو خاموش کرنے کے لیے بڑھیں۔ مگر خالد نے تیور بد لے بغیر کہا ”تو کیا آپ کے خیال میں یہ کوئی بہت بری بات ہے؟ وہ تو خیر گزری کہ بات وہیں ملکی تھک ختم ہو گئی ورنہ اس روز تو میں پی پی کر مر جانے کا ارادہ کر کے آیا تھا۔“

شیانے سر کے ایک جھٹکے کے ساتھ پلاٹ کر خالد کو دیکھا اور عطیہ نیشن کو بڑی دلچسپی سے دیکھتی ری جو اپنے نئے پیگ میں رب نواز سے سوڈاڈ لوار ہی تھی۔

”کیوں کیا بات تھی اس روز؟“ بیگم نور الہدی نے اپنی ایک باچھہ کو پھیلا کر پوچھا۔ ”خیریت تو تھی؟“ خالد بولا ”مجی ویسے تو بھسہ وجودہ درجہ بدرجہ خیریت ہی تھی لیکن بعض اوقات روز بروز کی خیریت بھی تو بور کر دیتی ہے۔ کر دیتی ہے“

اس پر سوائے بیگم نور الہدی اور چند دوسرے اصحاب کے سب ہنسنے لگے۔ یہ چند دوسرے اصحاب وہ اصحاب تھے جو پیگ پینے کے بعد آؤ چھے مرجاتے تھے یا بہت زیادہ رقیق القلب ہو جاتے تھے اور دوسروں کی باتوں میں کسی ایسے اشارے کی تاک میں رہتے تھے جس پر وہ زار زار رو سکیں۔ ایس محمد عارف، سیمیٹھ بھائی بھائی اور مسٹر سینٹلڈ مسٹر اسی نوعیت کے اصحاب تھے۔ البتہ ہمارے دوست عرفان پر نیما غنودگی کا عالم طاری ہو جاتا تھا اور وہ بھی بھی جیسے نیند سے چونک کراپنی زندگی کا ثبوت بھم پہنچا تاہر ہتا تھا۔

ہنسی رکی تو خالد بولا ”بھی حمید! اور اس لیے ہوئی کہ ہم دونوں چلے آتے تو عطیہ ایکلی رہ جاتی۔ آج کل ان کا سارا گھر پشاور گیا ہوا ہے۔ آدھا گھنٹہ عطیہ کو یہ سمجھانے میں گزار کہ حمید کے ہاں تکلف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مگر وہ برا بر تکلف کرتی رہی۔ پوچھا واس سے۔“

”اب خدا کے لیے ہمیں شرمندہ تونہ کیجئے۔ بیگم حمید شرما کر بولیں۔

”شیم شیم۔“ عرفان نے تپائی کو تھپتھپا کر کہا۔ وہ کسی زمانے میں اسیلی کارکن رہ چکا تھا۔

”اگر عطیہ نہ آتی تو ہماری لڑائی ہو جاتی۔“ حمید بولا۔

”لڑائی ہی کے ڈر سے تو آگئی ہوں۔“ عطیہ بنس کر بولی۔

”لڑائی کا ذکر نہ کیجئے بھائی۔“ شیانے مسکرا کر کہا۔ ”تیسرا عالمی جنگ سر پر کھڑی ہے۔ اللہ اللہ کیجئے۔“

”اللہ اللہ۔ اللہ اللہ۔ اللہ اللہ۔“ عرفان ذکر کرنے لگا۔

شیا اور عطیہ خاص مہماںوں کے صوفے پر نیشن اور رب نواز کے مقابل جا بیٹھیں۔ خالد کے لیے بہت سی جگہیں خالی کر دی گئیں مگر وہ یہ کہتا ہوا خاص صوفے کے ایک سرے پر شیا کے پاس بیٹھ گیا کہ ”حضرات! شاید آپ نئے میں بھول رہے ہیں کہ یہ دعوت میرے اعزاز

میں دی جا رہی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ عام مہمانوں کی طرح دو چار پیگ پر ٹرخا دیا جاؤں۔ میں تو اپنے حصے کی پوری بوتل ہیوں گا۔ اس لیے یہاں اپنی مسر کے پاس بیٹھوں گا۔"

سب ہنسے۔ پھر حمید نے وائٹ ہارس کی سچی چھپ پوری بوتل اس کے سامنے رکھ دی۔ خالد نے اپنا دگنا پیگ بنایا اور دور سے آنے والے پیاسے مسافر کی طرح ایک ہی سانس میں چڑھ گیا۔ ٹریا کے گلاں میں شیری ڈالنے کے بعد حمید نے بوتل عطیہ کے گلاں پر جھکائی تو عطیہ نے گلاں پر ہاتھ رکھ دیا اور مسکرا کر حمید دیکھنے لگی۔ حمید نے پوچھا۔ "یہ شربت نیلوفر بھی چھوڑ دیا کیا؟" "مگر عطیہ نے ٹریا کی گود پر سے اپنا بازو گزار کا گلاں خالد کے سامنے بھیک کے پیالے کی طرح رکھ دیا۔ وہ اپنا دوسرا پیگ بناتے ہوئے رک گیا اور بڑی وحشت سے عطیہ کو دیکھنے لگا مگر عطیہ اپنی بہن کو گود میں آدمی لیشی ہوئی مسکراتی رہی اور بولنے کے بجائے اپنا گلاں بلاتی رہی۔ ٹریا نے اسے ہٹانے کی بھی کوشش کی اور یہ کہہ کر ڈالنا بھی کہ "پالکل ہوئی ہے کیا؟" مگر یہاں یک ساری محفل نے تالیاں بجادیں۔ یہ تالیاں اس وقت تک بھتی رہیں جب تک دم بخود خالد نے عطیہ کو ایک پیگ تیار نہ کر دیا۔ عطیہ بڑے اطمینان سے وہ سکی سپ کرنے لگی اور ساری محفل نے اپنے جام بلند کر کے عطیہ کی مستقل مزاجی کی دادوی اور شراب نوشی کے معاملے میں اس کی استقامت کی دعا مانگی۔ خالد اور ٹریا ہیران بیٹھے سب کچھ سنتے اور دیکھتے رہے۔ پھر یہاں یک خالد جیسے شعوری طور پر سنجلا۔ دوسرا پیگ پیا۔ سگریٹ سلاگا یا اور جیسے ذہن کی دھول جھاڑ کے لیے بولا۔ "ہاں تورب نواز! تمہارے تیروں سے معلوم ہو رہا ہے کہ تم پاٹی چھپ پیگ چڑھا چکے ہو اس لیے کسی مسئلے پر بحث کر رہے ہو۔"

"جی ہاں۔" شہید بولا۔ "قبلہ رب نواز صاحب محبت پر بحث کے مسئلے پر اپنے ارشادات سے حاضرین کو مستفید اور مفہوم فرمائے تھے۔"

"یہ تو بڑا ناٹک مسئلہ ہے نواز۔" خالد نے کہا۔

"یہ جو شہید ہے تا، رب نواز نے خالد کو بتایا۔" یہ از روئے نفیات محبت کی دنیا کا یتیم ہے اس لیے وہ صاف جھوٹ بولا ہے۔ بحث شادی کی عمر پر ہو رہی تھی لیکن اب اس نے کہا ہے تو چلو محبت پر بحث کیے لیتے ہیں۔ اسی سے کہئے شروع کرے۔

شہید بولا "اپنے بائیں طرف سے شروع کرو۔"

رب نواز چونکا بھی اور مسکرا یا بھی۔ "میرے بائیں طرف تو میں نیشن بیٹھی ہیں۔"

"میں کیا عرض کروں گی۔" نیشن بولی "ان سے پوچھئے جنہوں نے شادیاں کر لی ہیں۔"

محبت کرنے کے لیے شادی کرنا ضروری نہیں ہوتا۔" شہید نے رائے ظاہر کی۔ "نواز سے پوچھ لیجئے۔"

"ہاں ہاں" نواز بولا۔ "میں شہید سے زندگی میں پہلی بار متفق ہو رہا ہوں۔ یہ بھیک کہتا ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ انسان شادی کرنے

کے لیے محبت کرے مگر شادی نہ کر سکے اور عمر بھر محبت ہی کرتا رہے۔ یوں بھی ہوتا ہے۔“

”وہ ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔“ عرفان نے بازو پھیلا کر مصروع پڑھا۔

شہید رب نواز اور میں نے بہت کوشش کی کہ کوئی صاحب محبت کے مسئلے پر کچھ بولیں مگر سب کتراتے اور ایک دوسرے پر فقرے چست کرتے رہے اور اس دوران میں خالد نے چاراً اور عطیہ نے دو پیگ چڑھا لیے۔ عطیہ نے ثریا کی گودے ہاتھ گزار کر خالد کے سگریٹ کیس میں سے ایک سگریٹ بھی نکال لیا۔ حمید نے سگریٹ لائٹر جلایا اور تالیوں کے درمیان عطیہ لبے لبے بھی نکال لیا۔ حمید نے سگریٹ لائٹر جلایا اور تالیوں کے درمیان عطیہ لبے لبے کش لینے کا نامہ اور ہنسنے لگی۔ یکاں یک ثریا نے عطیہ کی انگلیوں سے سگریٹ نوچ کر ایش ٹرے میں پھینک دیا مگر عطیہ اسی طرح کھانستی اور ہنسنی رہی۔

اچانک نیشن بولی۔ ”بھی سچی بات تو یہ ہے کہ محبت کے مسئلے پر تو خالد صاحب ہی بہتر رائے ظاہر کر سکتے ہیں۔ تازہ تازہ تھوڑے ہے۔ کل شام ہی کوہنی موں سے لوٹے ہیں۔ آپ بیتی کا معاملہ ہے۔ یا اگر آپ سب لوگ مختلف طور پر قرارداد منظور کر لیں تو ثریا سے درخواست کی جائے کہ وہی اس بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کریں۔“

”کیریڈ، کیریڈ۔“ عرفان نے تائید کی ڈھیل ڈھالی تالی بجا لی۔

”جی مجھے تو بخشنے۔“ ثریا نے ہاتھ جوڑ کر کہا اور پھر خالد کے کندے سے کندھاگا کر بیٹھ گئی۔

”عطیہ تو خیر کیا بتا سکیں گی۔“ نیشن مسکرا لی۔

”عطیہ تو ابھی بہت چھوٹی ہیں۔“ بیگم نور الہدی بھی مسکرا گئی۔ مگر پھر نہ جانے کیا ہوا وہ زور زور سے ہنسنے لگیں اور ہنسنی چلی گئیں۔ پھر نیشن کو بھی بھی چھوٹ گئی۔ دونوں بھی پر ضبط پانے کی کوشش ضرور کر رہی تھیں مگر ان کی بھی ضبط کے بند توڑ توڑ کر نکل رہی تھی۔ اس بے سب بھی پر محمد عارف بھائی اور ریتلڈ سعیج تک چونک پڑے اور عرفان یوں گھبرا یا گھبرا یا ساد یکھنے لگا جیسے دونوں خواتین اسی پر بھس رہی تھیں۔ سب کو جیسے عطیہ کے چھین مار کر رو دینے کا انتظار تھا۔

”معلوم ہوتا ہے آپ دونوں کو بہت شوق ہے میری محبت کی کہانی سننے کا۔“ عطیہ کے لمحے میں طرز تھا۔ ”مگر آپ تو سننے سے پہلے ہی محفوظ ہوئی جا رہی ہیں۔“

بیگم نور الہدی اور نیشن کی بھی ایک دم رک گئی اور کرے کا احوال سخت ریقق ہو گیا۔

”تو پھر سنائے۔“ نیشن نے ہمت کی۔

”شووق سے سننے۔“ عطیہ بولی۔ ”اگر آپ“

”عطیہ بی بی! ہپ ہپ ہرا۔“ عرفان نے گلاس والا ہاتھ اٹھا کر نعرہ مارا۔

عطیہ بلوتی رہی ”اگر آپ سب لوگ ایمانداری کے ساتھ اپنی سب سے پیاری چیز کی قسم کھا کر اپنی اپنی محبت کا حال سنانے کو تیار ہیں تو میں بھی حاضر ہوں۔“ عطیہ نے بڑی متانت سے اتنے بہت سے لوگوں کو چیلنج کر دیا۔

”اور اگر کسی نے محبت کی ہی نہ ہو؟“ نیشن نے پوچھا۔

”نام سنس۔“ عرفان بڑا بڑا یا۔

عطیہ فوراً بولی ”اگر کسی کو یہ شبہ ہوا کہ اس نے محبت کی ہی نہیں تو اس کے لیے بہتر صورت یہ ہے کہ وہ اپنے گریبان میں منڈال کر ذرا زیادہ غور سے دیکھ لے۔ میں مان ہی نہیں سکتی کہ کوئی شخص زندگی میں کم سے کم ایک بار بقاگی ہوش و حواس، محبت میں اپنے ہوش و حواس نہ گناہ بیٹھے۔“

”عطیہ کو ہماری بھی بری الگی حالانکہ کم سے کم میں تو اس پر نہیں بہس رہی تھی۔“ نیشن نے کہا۔ ”میں تو اس بات پر بہس رہی تھی کہ جانے کیوں بعض لوگ ہنرنے پر آتے ہیں تو ان کی بھی رکتی ہی نہیں۔“

بیگم نورالہدی بہت سمجھیدہ ہو گئیں۔ پھر پرس میں سے آئینہ نکال کر ایک نئے سے روپاں سے اپنی پلکیں خشک کرنے لگیں۔

عطیہ نے نیشن کی معدہرت کا کوئی تو شک نہ لیا۔ وہ بلوتی رہی ”محبت گناہ نہیں ہوتی، ہر شخص کا ذاتی مسئلہ ضرور ہوتی ہے اور مغلقوں میں کسی کی محبت کے بجائے کسی کی شادی کا اعلان زیادہ بھلا لگتا ہے۔ لیکن اگر آپ کو دوسروں کی شخصیتوں کو بے لباس کرنے کا ایسا ہی شوق ہے تو معقولیت کا تقاضا یہ ہے کہ پہل خود سمجھئے۔ دیکھئے آپ یہاں بیٹھی وہ کسی بھی پی رہی ہیں اور غیر مردوں کے گلے میں باہیں بھی ڈال رہی ہیں۔ پھر اگر آپ کو اس میں کوئی جھجک نہیں تو یہ بتانے سے کیوں جھجک رہی ہیں کہ آپ محبت کی بالکل نچرل ارج کے ہاتھوں کہاں اور کیسے مجبور ہوئی تھیں۔“

جب تک عطیہ بلوتی رہی سب لوگ گم سی بیٹھے رہے۔ نیشن بھی جیسے نائٹ میں آگئی۔ پھر جب عطیہ بول چکی تو سب کو ایک دوسرے سے نظریں ملانے کی فرصت ملی۔ خاموشی کا یہ لمحہ بہت مختصر تھا مگر بہت بحدائقہ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ لمحہ ایک ٹھوس مریٰ چیز بن کر سب کے سینے میں گز گیا ہے۔

شہید نے بہت کی۔ ٹھانفت سا الجہا اختیار کر کے بولا ”بسم اللہ رب نواز سے ہونی چاہیے۔“ رب نواز دا نیں باعیں دیکھنے لگا تو شہید بولا۔ ”نہیں پیتا! آج تو بہت بڑے پھنسنے۔ آج تو جسمیں اپنے قلبے کا مرہم ہٹا کر اپنا زخم دکھانا ہو گا۔ آج تو میری جان کوئی نہ کوئی جھوٹ تراشنا ہی ہو گا اپنی سب سے پیاری چیز کی قسم کھا کر۔“

”ٹھہر یے حضرات ٹھہر یے۔“ بیگم حمید اٹھ کھڑی ہو گئیں۔ آپ لوگ ایک بہت بڑی آزمائش میں ڈال دیے گئے ہیں اس لیے بھیت میزبان میرا قرض ہو جاتا ہے کہ ابتداء میری طرف سے ہو۔“

”مگر کیا سب لوگ اس اعتراف کے لیے تیار بھی ہیں؟“ خالد نے اعتراض کیا اور شریانے تائید میں یوں بے ساختہ سر ہلا کیجیے پہلی بار کسی نے اس کے دل کی بات کی ہے۔ سب لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

نشیمن نے دہکلی پی تو چند قطرے اس کی باچھوں سے بہہ کر اس کی ٹھوڑی پر جمع ہو گئے اور پھر گردان سے ہوتے ہوئے غائب ہو گئے۔

”میں تیار ہوں۔ میرا باپ تیار ہے۔ میرا دادا تیار ہے۔“ عرفان یاکا یک کھڑا ہو گیا مگر پھر جھول کر صوفے پر گر گیا اور اسی گری ہوئی حالت میں مسکرانے لگا اور ایک ہاتھ کر کے یوں بلانے لگا جیسے اس کی بات ابھی تک جاری ہے۔

خالد پھر بولا ”سب لوگوں کے تیور بتا رہے ہیں کہ سب تیار نہیں ہیں اس لیے چلنے والوں کے لیے کوئی اور موضوع چنیں۔“

”کھانا ہی کیون کھالیا جائے۔“ حمید نے تجویز پیش کی اور پھر کسی جواب کا انتظار کیے بغیر پاکرا۔ ”خانہ ماں! کھانا لگا دو۔“

”خالد بولا“ مس نشیمن ہی اس قصے کو ختم کرنے کا اعلان کریں اور کوئی نیا موضوع بھی تجویز کریں۔ مثلاً دنیا کا بدلتا ہوا موسم کیوں با اور کانگو، خلا کا سفر، مریخ کی مخلوق۔“

”بھی نہیں۔“ عطیہ آگے کھسک کر صوفے کے کنارے پر بیٹھ گئی۔ ”نشیمن نے بڑے طنز سے جو اشارہ کیا تھا، اس کا مطلب میں بہت اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ میں تو ان کی بھی کی زبان بھی سمجھ گئی تھی۔ میں مصر ہوں کہ سب اپنی اپنی محبتتوں کی کہانی سنائیں اور اگر کوئی جھوٹ بولے تو اسے ٹوک دیا جائے۔“

”ہوش میں تو ہو عطیہ؟“ خالد نے خاصی سنجیدگی سے پوچھا۔

”پاگل ہے۔“ شریابوی اور عطیہ کا تیسرا پیگ اس کے سامنے سے اٹھا کر تپانیٰ کے نیچے رکھ دیا۔

عطیہ نے جیسے اپنی بہن اور بہنوئی کی بات سنی ہی نہیں۔ بولی ”ہاں تو نشیمن صاحب اپنی سب سے پیاری چیز کی قسم کھا کر اپنی آپ میں شروع کیجئے مگر یاد رکھیے کہ آپ جھوٹی قسم کھائیں گی تو آپ کی سب سے پیاری چیز مر جائے گی۔“

”ہائے اللہ یہ لڑکوں نے کیسی فضول باتیں شروع کر دی ہیں۔“ بیگم شفقت اللہ نے پہلی بار بالواسطہ پر اپنی بیٹی کے حق میں پکھ کھہا۔

رب نواز ہاتھ میں بوٹل لیے اٹھا۔ تو ازن قائم رکھنے کے لیے ناگلیں پھیلادیں اور بولا ”کیا پینے اور بولنے کے دونوں کام اکٹھے نہیں ہو سکتے؟ یہ بہت غلط بات ہے کہ باتوں باتوں میں پینے کا دور ک گیا ہے۔“

پینے میں صرف نیشن نے رب نواز کا ساتھ دیا۔

رب نواز نے آخری گھونٹ لے کر کہا ”خواتین و حضرات اب سے پہلے مجھے فارغ ہو لینے دیجئے ورنہ جب تک آپ لوگ بولیں گے یہ اعتراف میرے سینے پر ایک بوجھ بنا رہے گا۔“

سب رب نواز کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ بولا ”میں اپنی سب سے پیاری چیز کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے محبت کی ہے۔ اور آپ سب لوگ جانتے ہیں کہ میں نے کس سے محبت کی ہے۔ میں نے بوتل سے محبت کی ہے۔“

”بڑا لوگ آدمی ہے۔ مگر صحیح بولا ہے۔“ شہید نے کہا اور لوگوں نے چند تھکے تھکے تھقہ لگائے۔ رب نواز دا بھیں باہم آگے پیچھے جھوتا ہوا بیٹھ گیا اور مسکرا کر نیشن کو دیکھنے لگا۔

پھر نیجم حمید اٹھیں ”میں حمید کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں نے حمید سے محبت کی اور اسی سے شادی کر لی۔“  
”کھلی ختم پیرہ ہضم۔“ شہید بولا۔

”آپ نے تو حمید کی زبان ہی کاٹ لی۔“ میں نے کہا۔

سب ہنسنے لگے مگر سب کی ہنسی کو کھلی اور مر جھائی ہوئی تھی۔

شہید نے اپنی ایک درجن محبوتوں کے واقعات خوب کھل کر سنائے۔ اس نے بتایا کہ ”بھی ہم یاروں نے تو مل کر محبت کا باقاعدہ ناممثبل بنا رکھا ہے کہ ایک لڑکی سے ایک دوست دوپہر تک محبت کرے تو اسی لڑکی سے دوسرے دوست کی محبت دوپہر سے شام تک ہو اور تیرے کی شام سے سینما کے آخری شوٹک۔ اور یہ ناممثبل اتنا مکمل ہے کہ میری زندگی کی پڑڑی پر گاڑیوں کے تصادم کا ایک بھی حادثہ نہیں ہوا۔ وجہ یہ ہے کہ متعلقہ لاکیوں نے بھی یہی پروگرام بنا رکھا ہوتا ہے۔“ آخر میں اس نے کہا ”بس ایک محبت ذرا سی گڑ بڑا گئی۔ میں معافی چاہتا ہوں مگر میں نے اپنی سب سے پیاری چیز کی قسم کھائی ہے اس لیے یہ بتانا ہی پڑے گا کہ اسی محفل میں ایک“

”حمید تقریباً چالا اٹھا۔“ نیمیں شہید یہ غلط ہے۔ لکھڑا لوگ ایسی باتیں نہیں کرتے۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔

لیکا یک نیجم نور الہدی نے شھنڈ اسادہ پانی مانگا تو نواز بولا۔ سادہ پانی! اس محفل میں! آپ تو شیری پر رہی تھیں۔“

”مجھے پیاس گئی ہے۔“ نیجم نور الہدی کی آواز بدی ہوئی تھی۔

”سادہ پانی منگا دیجئے۔ عرقان کی آواز آئی۔“ سادہ پانی۔ شیپ واٹر۔ ایکواچیورا۔“

نیجم شفقت الہی تک نے اعتراف کر لیا کہ انہوں نے شادی سے نیشن کے تایا سے محبت کی مگر ان کی شادی نیشن کے ذیذی سے ہو گئی اس لیے ان سے محبت کرنے لگیں۔ اب وہ مرچے ہیں لیکن اگر آج نیشن کے تایا زندہ ہوتے تو ان کی محبت میں تازگی آ جاتی گر قسم

کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔

میں نے اپنی محبت کا قصہ سنایا تو سب بے حد منظوظ ہوئے اور مخالف میں شکافتگی کی ایک اہر دوڑ گئی۔ وجہ یہ تھی کہ میں نے ایک ہی محبت کی تھی اور میری محبت کے بھی کھنڈ راب تک میری پناہ گاہیں تھے۔ ”ایک ہی محبت“ کا یہ واقعہ سب کے لیے ایک اطیفہ ثابت ہوا اور مجھے ”محبت کا افلاطون“ اور ”محنوں 1960“ کی قسم اقتاب سے نوازہ جاتا رہا۔

”ایک ہی محبت کی بات تو ایسی ہی ہے جیسے انسان زندگی میں صرف ایک بار کھانا کھائے اور عمر بھر ڈکاریں لیتا رہے۔“ شہید بولا اور سب لوگ خوب نہیں۔

اب بیگم نورالہدی کی باری تھی۔ وہ سادہ پانی ایک گھوٹ پی رہی تھیں۔ ساری مخالف ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر انہوں نے کلاس تپائی پر رکھ دیا اور بت بن کر بیٹھ گئیں۔ نیشن نے ایک بار انہیں بلا یا تو جواب میں ان کے ہونٹ ہلے مگر کاپتے گئے۔ پھر وہ رونے لگیں۔ خاصی بلند آواز سے رونے لگیں۔ مرد گھبرا کر انھوں کھڑے ہوئے مگر ان میں سے بیشتر لاکھڑا کر صوفوں پر گر پڑے۔ شہید مکرانے لگا۔ بیگم شفقت الہی اور نیشن توہنیں دیں مگر ثریا اور عطیہ چپ چاپ بیٹھی رہیں۔ بیگم حمید نے لپک کر بیگم نورالہدی کو اپنے بازوں میں لے لیا۔ پھر عطیہ بولی ”کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ بیگم صاحبہ کو اعتراف سے معاف کر دیا جائے؟“  
یہ تجویز آنکھوں ہی آنکھوں میں منتظر کر لی گئی۔

”آپ لوگوں نے سب سے پیاری چیز کی قسم نہ دی ہوتی تو میں ضرور بتا دیتی۔“ بیگم نورالہدی نے بچوں کی طرح سکتے ہوئے کہا اور انھوں کو با تھروم میں چلی گئیں۔ بیگم حمید ان کے پیچھے دوڑیں۔ ان کے جانے کے بعد چند لوگ نہیں۔

شہید نے چکے سے احتجاج کیا۔ ”اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ ذرا سارہ دینے سے خلاصی ہو جاتی ہے تو مجھے اپنے معاشرقوں کی فہرست مرتب کرنے کی کون ہی ضرورت مارے جا رہی تھی۔“

وہ سکی اور شیری کا ایک اور دور چلا۔ عطیہ نے تپائی کے نیچے سے اپنا کلاس انٹھا لیا اور شریا بے بی سے دیکھتی رہی۔ بیگم نورالہدی منہ دھوکر اور میک اپ درست کر کے بیگم حمید کے ساتھ واپس آگئیں تو رب نواز صدارت کے فرائض انجام دیتے ہوئے بولا۔ ”اب مس نیشن کی باری ہے۔“

”نیشن اچھا نام ہے۔“ عرفان آنکھیں بند کیے بولا۔ ”عرفان بھی اچھا نام ہے۔ تمہارا بھی اچھا نام ہے، ہمارا بھی اچھا نام ہے۔“ پھر وہ گانے لگا۔

”نام منظور ہے تو پل بننا، چاہ بننا، مسجد بننا، تالاب بننا۔“

لشمن کی بڑی بڑی باہر اعلیٰ پڑتی ہوئی آنکھیں کی پتلیاں اور پہلوں میں آدمی آدمی چپ گئی تھیں۔ اس کارنگ انگارہ ہو رہا تھا۔ ناک کے بانے، نعلیے ہونٹ کے خم اور گردن پر پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ اس نے آدھا بھرا ہوا گلاس یوں تھام رکھا تھا جیسے وہ سکی کو ایک پتلی دھار میں فرش پر گرانے کی سوچ رہی ہے۔ وہ انھیں ذرا سی جھوٹی پھر بولی۔

”جی ہاں! میں نے محبت کی ہے۔ عطیہ ٹھیک کہتی ہیں۔ ہم سب نے محبت کی ہے کہ مجھے محبت کرنے کا سلیقہ نہیں آیا۔ میں ایک سے محبت کر رہی ہوتی ہوں کہ اس دوران میں مجھے دوسرے سے بھی محبت ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ پہلا مجھ سے بے وفائی کر جاتا ہے اور میں اپنے آپ کو بھلا دینے کے لیے تیرے آدمی سے محبت کرنے لگتی ہوں مگر پھر کہیں سے چوتھا آ جاتا ہے۔ اپنی اٹھائیں برس کی عمر میں.....“

اٹھائیں برس؟ رب نواز بے ساختہ چیخا۔ ابھی ابھی تو آپ کی ممی.....“

”جی ہاں،“ لشمن نے رب نواز کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”اپنی اٹھائیں برس میں عمر اتنی محبتیں کی ہیں میں نے کہ شمار کرنے بیٹھوں گی تو کہیں نہ کہیں غلطی ضرور ہو جائے گی۔ قصہ کوتاہ یہ کہ میں محبت کرتے کرتے بور ہو چکی ہوں۔ اب میں نفرت کرنا چاہتی ہوں۔“ اس نے رک کر ایک گھونٹ بھرا۔

”نفرت کرنے کا بھی ایک سلیقہ ہوتا ہے۔“ رب نواز بولا۔ ”کہیں یہ نہ ہو کہ آپ چلی تو ہوں نفرت کرنے اور واپس آئیں تو آپ کی محبت ہو چکی ہو۔ دوستوں کی کے ایک ناول میں.....“

”آپ کیوں زیادہ فکر کرتے ہیں؟“ لشمن نے رب نواز کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”اطمینان رکھئے کہ آپ سے نہ تو محبت کرتی ہوں نہ نفرت کرتی ہوں۔ نفرت بھی اسی سے کی جاتی ہے جس کی ایک شخصیت ہوتی ہے۔ وہ آخری آدمی جس سے میں نے محبت کی ہے میری نفرت کا سب سے زیادہ مستحق ہے۔“

اب لشمن نے ان لوگوں کے نام، عہدے، سماجی مرتبے، پتے بلکہ ان کے بچوں کی تعداد تک بتا دی جن سے اس نے محبت کی تھی۔ آخر میں اس نے کہا۔ ”میں آخری آدمی کا نام نہیں لوں گی اور امید ہے عطیہ کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ دراصل اس آخری محبت نے میرا بیٹھنے کے ساتھ دیا ہے اور میں وہ سکلی کو بھی ہضم کر لیتی ہوں۔ میرا ارادہ تھا کہ اس آخری آدمی سے محبت نباہوں گی یعنی شادی کر لوں گی مگر اس دوران میں ہماری ممی کو بھی اس سے محبت ہو گئی۔“

”بکومت نشمن!“ بیگم شفقت الہی چیخ اٹھیں۔

کھانا لگا دیا صاحب! خانہ مام کی آواز آئی مگر اس کی طرف بیگم حمیدک متو junction ہو گیں۔

نشیمن اپنی ماں کی طرف دیکھئے بغیر بولتی رہی "میں پڑھی لکھی ہونے کے باوجود ابھی تک پرانے قبائلی لوگوں کی طرح اپنی ماں کی عزت کرتی ہوں اس لیے میں نے اپنی آخری محبت کی قربانی دے دیا ہے اور مجی کی غفریب شادی ہونے والی ہے۔"

بیگم شفقت الہی تڑپ کر کھڑی ہو گیں تو تپائی الٹ گئی اور گلاس ایک دوسرے سے بجھتے ہوئے قالین لڑھک گئے۔ "بے شرم، وہ کڑکیں۔

"نان سنش۔" عرفان نشے میں بکا۔

نشیمن وہ سکی پینے لگی اور اس کی ای نے دھپ سے بیٹھ کر شیری کا ایک گلاس جیسے ایک انتقامی جذبے کے ساتھ اپنے اندر انڈیل لیا۔

"خالد صاحب۔" نشیمن گلاس خالی کر کے پکاری۔

"جی۔" خالد یوں بولا جیسے اسے اپنے پکارے جانے کی توقع نہ تھی۔

"بسم اللہ۔" نشیمن بولی۔

"میرا قصہ تو مختصر سا ہے۔" خالد نے پہلو بدل کر وہ سکی کا گلاس اٹھایا اور اسے انگلیوں میں گھمانے لگا۔

"اپنی سب سے پیاری چیز کی قسم کھا کر بتائے۔" نشیمن نے مشورہ دیا۔

"جی عرض کرتا ہوں۔ خالد نے ذرا ساتا گواری سے کہا۔ پھر اپنے آپ کو سنجال کر مسکرا کر بولا" میری محبت کا نتیجہ تو آپ کے سامنے ہے۔ میں تو ہمیں موں بھی مناچکا ہوں۔" اس نے ثریا کی طرف دیکھا اور وہ ایک لمبی سانس لے کر مسکرانے لگی۔

"یہی بات ہے؟" نشیمن نے پوچھا۔

"تو اور کیا بات ہے؟" خالد بولا "میری شادی میں تو یہ سب حضرات شریک تھے، ان سے پوچھ جیجے۔ اخباروں میں ہم دونوں کی تصویر بھی چھپی تھی۔"

"یعنی آپ اس سے زیادہ کچھ نہیں بتائیں گے؟" نشیمن بولی۔

"اس سے زیادہ کا مطلب کیا ہوا؟" خالد نے سمجھیدہ ہو کر پوچھا۔

"مطلب یہ ہے، اچانک عطیہ بولنے لگی" کہ کیا آپ اپنی سب سے پیاری چیز کی قسم کھا کر بس اتنا ہی بتائیں گے؟"

خالد اور ثریا نے عطیہ کو ایک ساتھ دیکھا۔

نشیمن بولی "اب فرمائے۔"

"آپ تو حدد کرتی ہیں۔" خالد پینے لگا۔

عطیہ پھیل پھی آنکھوں سے خالد کو دیکھنے لگی۔

"اور شریا صاحب آپ؟" نیشن نے پوچھا۔

"جی میں تو پہلے سے عرض کر چکی ہوں کہ مجھے بخشنے۔" شریا بولی۔

"ہاں ہاں۔" عرفان بولا۔ "ٹھیک ہے۔ انہوں نے کہہ دیا تھا۔ ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ واقعی کہہ دیا تھا۔ ٹھیک ہے سب ٹھیک ہے۔"

"اور عطیہ آپ؟" نیشن بولی۔

"کھانا لگادیا صاحب؟" خانہ مار کی آواز آئی۔

"آپ بھی کیا یہی بہانہ کریں گی؟" نیشن نے پوچھا۔

"جی نہیں۔" عطیہ بولی۔ اس کا سنہر ارنگ سفید پڑ گیا تھا اور اس کی انگلیوں میں کچھی تھی۔ "میں عرض کرتی ہوں۔ میں اپنی سب سے پیاری چیز کی قسم کھا کر جھوٹ نہیں بولوں گی خالد بھائی کی طرح۔"

شریا نے یوں تیزی سے پلٹ کر عطیہ کو دیکھا جیسے اسے ماڑ ڈالے گی۔

پھر اس نے خالد کی طرف دیکھا اور خالد عطیہ کو دیکھنے لگا۔

"تو کیا آپ نے محبت کی ہے؟" نیشن وکیلوں کے سے لجھے میں بولی۔

"جی ہاں!" عطیہ جیسے عدالت میں کھڑی تھی۔

"کس سے؟" نیشن نے پوچھا۔

یکا یک حمید بول اٹھا۔ دیکھنے میں نیشن! طے پاچکا ہے کہ اس قسم کے پرس سوال کا جواب کوئی دینا چاہے تو ٹھیک ہے ورنہ کسی کو مجبور نہیں کیا جاسکتا۔"

"خالد بھائی سے۔" عطیہ بولی۔ "میں نے خالد بھائی سے محبت کی ہے۔ پوچھ لجئے ان سے۔" ساری محفل کے سینے پر جیسے کسی نے گھونسا دے مارا۔

"بکومت عطیہ، شریا چیخ اٹھی۔ شرم نہیں آتی کیمی کو کہ۔-----"

خالد نے شریا کے منہ پر بڑی سختی سے ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔ "یہ کیا بک بک ہے شریا؟"

"خالد بھائی اپنی سب سے پیاری چیز کی قسم کھا کر جھوٹ بول گئے مگر میں ان کی قسم کھا کر جھوٹ نہیں بولوں گی۔"

عطیہ سحر زدہوں کی طرح بول رہی تھی۔ "وہ میری قسم کھا کر جھوٹ بول گئے مگر میں ان کی قسم کھا کر جھوٹ نہیں بولوں گی۔ میں تو چاہتی

ہوں کروہ جگ جسیں۔ میں ان کی جھوٹی قسم کیوں کھاؤں؟“

”پو اسکت آف آرڈر! پو اسکت آف آرڈر!“ عرفان پکارا۔

محمد عارف بھائی اور نبیلہ تھیں اپنے آنسو پوچھنے لگے۔

”خالد بھائی!“ عطیہ بولتی رہی۔ ”ثیرا جی سے شادی کرنے کے بعد آپ نے مجھ سے یہ دوسری بے وفائی کی۔“

”میں تمہارا منہ نوج لوں گی عطیہ!“ ثیرا عطیہ پر جھپٹی مگر خالد نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی طرف سمیٹ لیا۔

عطیہ کی آنکھوں سے آنسو ہلک کراس سے گا لوں پر آئے اور تیزی سے اس کی گود میں گر گئے۔

نیجم نور الہدی اونچی اونچی رو نے لگیں۔

”میں بارہ برس کی تھی جب میں نے خالد بھائی کو چاہا۔“ عطیہ کی آواز بھرائی اور حکمتی ہوئی تھی۔

”دیکھا؟ نہ کہتا تھا کہ عمر کی کوئی قید نہیں۔“ رب نواز خوش ہو کر بولا۔

”بکومت۔“ شہید نے اسے ڈانت دیا۔

”اب میں میں برس کی ہوں۔“ عطیہ کہہ رہی تھی۔ ”میں آٹھ برس سے محبت کر رہی ہوں مگر باجی نے آٹھوں کی محبت کے بعد انہیں

مجھ سے جیت لیا۔“

”عطیہ!“ ثیرا نے عطیہ کو جیسے گالی دی۔

نیجم نور الہدی لپک کر با تھروم میں چلی گئیں۔

عطیہ بولے جا رہی تھی۔ ”مجھے ابا اور امی نے بتایا کہ شادی پہلے بڑی تباہیوں کی ہوتی ہے اور بڑوں کو محبت کرنے کا بڑا حق حاصل ہوتا ہے۔ مجھے خالد بھائی نے بتایا کہ تمہیں حاصل نہ کر سکنے کے باوجود تمہارے قریب رہنے کا یہی تو ایک بہانہ رہ گیا ہے کہ میں تمہاری باجی سے شادی کر لوں۔“

اچانک ثیرا نے خالد کی گرفت سے چھٹ کر عطیہ کے منہ پر تراخ سے تھپڑ دے مارا۔ ساری محفل ہڑ بڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی تو والٹی ہوئی تباہیوں پر سے لڑھک کر بولیں اور گلاس چٹاٹخ پناخ ہو کر نٹ گئے۔ خالد نے آگے بڑھ کر ثیرا کا دوبارہ اٹھا ہوا ہاتھ بڑی سختی سے کپڑا اور اسے ایک جھٹکے سے یوں پیچھے ہٹایا کہ وہ نیشن کے صوفے کے بازو پر جا گری۔

”سپورٹ میں پرست کا تو تم میں ایک ذرہ تک نہیں۔“ خالد نے ملامت کی۔

اس دوران میں نیشن نے عطیہ کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا تھا اور وہ اس کے سر پر گال رکھے آنسو بھاری تھی۔ نیجم حمید اپنے سینے پر

ہاتھ باندھے عطیہ کے پیچھے گم کھڑی تھیں اور روئی ہوئی نجم نور الہدیٰ با تھر دم کے دروازے میں سے جھانک رہی تھیں۔ بیگم شفقت الہی کو کسی سے کوئی سروکار نہ تھا۔

رب نواز نے سگریٹ کا جلتا ہوا حصہ ہونٹوں میں رکھ لیا اور پھر اپنے ہاتھوں سے اپنا منہ نوچ کر بیٹھ گیا۔ خالد عطیہ کے پاس قریب گیا تو شین اللہ کر آنسو پوچھنے لگی۔ ایک لمحے کے بعد خالد عطیہ کے پاس بیٹھ گیا مگر فوراً اللہ کھڑا ہوا۔ شریا کا رنگ مٹی ہو رہا تھا۔ وہ جس صوف کے بازو پر گردی تھی وہیں بیٹھ گئی تھی اور خالد کو گھورے جا رہی تھی۔ یکا یک خالد ایک دم عطیہ کے پاس بیٹھ گیا اور اسے ایک بازو میں سمیت کر اپنے پہلو میں دباتے ہوئے بولا ”رمضت عطیہ! میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔ میں تم سے اگلی پچھلی ساری غلطیوں کی معافی چاہتا ہوں۔“

شریا پک کر آئی اور خالد کے سر پر چیختی ”تم میری ہنگ کر رہے ہو خالد! اور میں تم سے اس کا ہنگ کا بدلہ لوں گی۔“

خالد بولا ”پہلے میں تم سے عطیہ کی ہنگ کا بدلہ تو لے لوں۔“

ساری محفل نے شریا کی چیخ کے انتظار میں سانس روک لی۔

”کیا ہوا؟ طلاق ہو گئی؟“ نجم نور الہدیٰ با تھر دم میں سے حواس باختہ باہر آ گئیں۔

”نان سنس۔“ عرفان بڑیڑا یا۔

یکا یک خانہ ماں کی آواز آئی ”کھانا گا دیا صاحب!“



## فالتو

جبیب احمد کی شادی کے دو سیز دن بعد ایک دوپہر کو لوگوں نے دیکھا کہ اس کا باپ سر پر دکھلو لے رکھے اور قدم قدم پر بجھتے ہوئے کڑے والا ایک صندوق بغل میں مارے تاک کی سیدھ میں دیکھتا ہوا لمبی گلی سے نکلا جا رہا ہے۔ ایکا ایکی وہ پلت کر پکارا "ایڑی اٹھا کر چل نیکاں۔"

لوگوں نے گھوم کر دیکھا تو لمبی گلی کے سرے پرے نیک بجھت سر پر ایک گھٹڑا اٹھائے آرہی تھی۔ "یہ میاں یہوی کہاں چلے؟" لوگوں نے ایک دوسرے سے پوچھا۔ پھر ایک بوڑھے نے ہمت کی اور آگے بڑھ کر بولا "کیوں بھائی پیر بخش کدھر جا رہے ہو؟"

"کھیتوں پر۔" پیر بخش نے فوراً جواب دیا۔ مگر ابھی ایسا سوکھا تھا کہ بوڑھے کو دوسرا سوال پوچھنے کے لیے ایک مل رکنا پڑا۔ "کھات کھٹو لے سمیت؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"یعنی اب وہیں رہو گے؟"

"ہاں۔"

"کیوں؟"

"بس۔" پیر بخش یہ لفظ یوں بالا کہ بوڑھے کے سوالوں کا خزانہ یکا یک ختم ہو گیا۔

اتنے میں نیک بھی آپنچھی۔ اس کے گھنٹوں ہاتھوں اور ہونٹوں پر رعشہ طاری تھا اور آنسو اس کی ایک ایک جھری میں پھیلے ہوئے تھے۔ جب اس نے دیکھا کہ سب لوگ اس کی طرف دیکھ رہے ہیں تو وہ گھبرا کر پیر بخش کو دیکھنے لگی مگر دیکھتے ہی بلبلہ کر رہو دی۔ گھٹڑکی میلکی چادر کو دونوں ہاتھوں سے کھینچتے اور مردہ تھے ہوئے اس نے بھرائی اور زخمی ہوئی آواز میں کہا "ہم سے مت پوچھو۔ جاؤ جیسے سے پوچھو جس نے" پیر بخش نیچے میں بول پڑا" گھر چھوڑنے سے پہلے چھت پر چڑھ کر ہو کا کیوں نہ دے دیا کہ جگد جگد ڈھنڈو را پسند کی ضرورت نہ پڑتی۔"

"چل وے چل۔" نیک بجھت پیر بخش کی طرف اپنا ایک ہاتھ ٹھنڈھ کی طرح بڑھا کر بولی اور چل پڑی۔

لمبی گلی کے کٹریک لوگ انہیں دیکھتے رہے۔ پھر تھوڑی ہی دیر میں یہ خبر سارے گاؤں میں گھوم گئی کہ شادی کے چوتھے ہی دن بعد جبیب کی

دہن اور جیب کی ماں کی آپس میں بھن گئی۔ نیک بخت اپنے بیٹے کی موجودگی میں دہن کے جہیز کے برتن آلوں اور پرچمتوں پر سجائی پھر رہی تھی کہ شیشے کا ایک گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر جیسی کی ایک پلیٹ پر گرا اور دونوں ٹوٹ گئے۔ دہن جو ساتھ والے کوٹھے میں لڑکوں میں گھری بیٹھی تھی، چھنا کا سن کر انھی۔ لے لے ڈگ بھرتی اور زیور چھپنے تھی آتی۔ ایک پل کھڑی ٹوٹے ہوئے برتوں کو گھورتی رہی اور پھر اس گھر میں آنے کے بعد پہلی بار بلند آواز میں بولی۔ ”ماں یہ تو میرے میکے کے برتن ہیں۔“

”تیرے میکے کے ہیں تو میرے بیٹے کے بھی تو ہیں۔“ نیک بخت نے جیب احمد کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔  
جیب احمد بولا ”میرے بھی ہوتے تو نئے برتوں کے ٹوٹنے کا رنج تو ہوتا ہے۔“

اور نیک بخت یوں نظر آنے لگی جیسے گلاس اور پلیٹ کے ساتھ وہ بھی ٹوٹ گئی ہے۔ شام کو اس نے شوہر سے شکایت کی۔ شوہر نے بیٹے سے شکایت کی۔ بیٹا بڑی تیزی سے دہن کے پاس گیا مگر جانے آپس میں ان کی کیا باتیں ہو گیں کہ واپس آیا تو باپ کے پاس چپکا کھڑا ہو گیا۔

پیر بخش نے ذرا سے انتظار کیا۔ پھر پوچھا ”کیا کہتی ہے؟“  
جیب احمد نے ماں باپ کی طرف دیکھے بغیر کہا ”کہنا کیا ہے بے چاری کو؟“  
نیک بخت طفر سے بولی ”نمیں نہیں بیٹا! پچھو تو کہتی ہو گی بیچاری“  
”بے چاری!“ پیر بخش یوں بولا جیسے غور کر رہا ہے۔

لیکا ایک جیب احمد آنکھیں نکال کر بولا ”تم کہوتا سے طلاق دے دوں؟“  
”میرے سامنے آنکھیں نہ نکال جسپے۔“ نیک بخت رو نے لگی۔

”نکل کر کے اپنے منہ سے میرا دودھ دھولے پہلے۔“ ماں نے دار کیا۔  
پیر بخش بولا ”تیری شادی کے خرچے میں سے چند روپے نکلے گئے ہیں۔ سو میں کل قبے میں جا کر تیری بوہمنی کو شیشے کا گلاس اور جیسی کی رکابی لادوں گا۔ اتنی سی بات ہے تا۔“

جیب احمد باہ کو گھوڑنے لگا۔ پھر تیز تیز چلتا ہوا گھر سے نکل گیا۔  
پانچ دن چپ چاپ گزر گئے۔ بیٹے نے ماں باپ سے کوئی بات نہ کی۔

ماں باپ بھی بھے بھے پھرتے رہے۔ وہ آپس میں بھی بہت کم بولے اور جب بولے تو بہت آہستہ جیسے اوپھی بولے تو کچھ ٹوٹ جائے گا۔ رات کو جب وہ صحن کے پر لے کونے میں دیوار کے پاس اپنے کھٹولے پرسونے کی کوشش میں کروٹیں بد لئے اور سوکنے کے کرب کو

دبانے کے لیے چت لیئے آسمان پر گلکنگی باندھے رکھتے تو صرف اس وقت چوڑھانے کی حد فاصل سے ادھر مقابل کی دیوار کے پاس بچھے ہوئے رُنگین پلٹکنوں پر کھسر پھسر کی آوازیں آتیں۔

”باتیں کر رہے ہیں۔“ نیک بخت جل کر سرگوشی کرتی۔

پیر بخش خاموش رہتا تو وہ پوچھتی ”جاگ رہے ہو کہ مر گئے ہو؟“

”کیا ہے؟“ پیر بخش اس کی طرف کروٹ بدل کر ناگوری سے پوچھتا۔

”میں کہتی ہوں، باتیں کر رہے ہیں۔“

”تو ٹھیک ہے کہیں۔ آخر میاں یہوی ہیں۔“

”میں کہتی ہوں، آپس میں بولتے ہیں، ہم سب کیوں نہیں بولتے؟“

”پہلے آپس میں توجی بھر کے بول لیں۔“

”سنوا!“ برتن ٹوٹنے کے پانچ دن بعد ایک رات نیک بخت نے کہا۔ ”جا کے گلاس اور رکابی خرید کر اپنی بھوکے منہ پر کیوں نہیں دے مارتے۔ اتنے دنوں سے کیا سوچ رہے ہو؟“

پیر بخش بولا ”سوچ رہا ہوں کہ بڑی چھوٹی بات ہے۔ خاتون کسی کنگلے گھر کی لڑکی تو ہے نہیں۔ یہ نہ ہو کہ میں تیرا حکم مانوں تو لڑکی عمر بھر ہمیں کمیتہ سمجھتی رہے۔ آخر ہمیں اسی گھر میں تو جینا مرنا ہے۔“

”تم مردوں یہ باتیں نہیں سمجھتے۔ بس تم گلاس اور رکابی لے آؤ۔“

”لے آؤں گا۔“

”کل ہی جا کر لے آؤ۔ جب تک نہیں لاوے گے مجھے میرا بیٹا بھی غیر محروم لگتا رہے گا۔“

جبیب احمد کی شادی کا دسوال دن تھا جب صحیح کی نماز کے بعد پیر بخش قبے گیا اور دو پھر سے پہلے شیشے کا گلاس اور چینی کی رکابی لا کر نیک بخت کے سامنے رکھ دی۔ وہ دنوں برتن ہاتھ میں لے کر اٹھی اور سیدھی میٹھی کی طرف بڑی جو چوڑھانے کی اوٹ میں بیٹھا تھا پی رہا تھا اور دہن کو دیکھ رہا تھا جو مسکرا کر مہندی کے رنگ کو چکانے کے لیے ہتھیلوں کو کھی سے چیڑ رہی تھی۔

”یہ لے بھوپنا گلاس اور اپنی رکابی۔ تیرا میرا حساب ختم۔“ نیک بخت بیٹھی کی بجائے بھوکی طرف بڑھی مگر بھوکے بجائے بیٹھا اور ماں کے ہاتھوں سے دنوں چیزیں چھین کر دیوار پر دے ماریں۔

نیک بخت چکر کھا کر بیٹھ گئی۔ پیر بخش جلدی سے چوڑھانے تک گیا مگر فوراً ہی پلت گیا۔ بعد میں نیک بھی روٹی بلبلاتی اس سے آٹی۔

دونوں نے آپس میں کچھ طے کیے بغیر صندوق اور گلہڑی میں اپنا سامان خوب بجا بجا کر رکھا۔ کھنولے دیوار سے گھیٹ کر چن کے وسط تک لائے اور پھر انہیں اخفا کر بیٹھے اور بہو کے سامنے ہی گھر سے نکل گئے۔

بیٹھے نے یہ تو کہا کہ ”یہ تم ٹھیک بات نہیں کر رہے ہو“، مگر اس نے ماں باپ کے تعاقب میں ایک قدم بھی نہ اٹھایا اور ماں باپ بھی گلی میں لوگوں کے ہجوم کو چیچھے چھوڑتے دور نکل گئے۔

پیر بخش اپنے کھیتوں میں خود ہی ہل چلاتا تھا تو اس نے کھیتوں کے شمال میں ڈھیری پر ایک کچا مکان ڈال لیا تھا۔ جب کھیت پکتے تو وہ نیک بخت سمیت یہاں آ جاتا۔ دونوں کھیتوں کی رکھوالی کرتے اور کھلیان سے فصل اٹھنے تک بیٹھیں رہتے۔ جیب احمد مدرسے میں پڑھتا تھا اور مدرسہ گاؤں میں تھا، اس لیے وہ اس دو تین صینے کے لیے اس کی پچھوپھی کے ہاں چھوڑ آتے۔ البتہ ہر ہفتے کی شام کو وہ ”ڈھوک“ پر آتا۔ ا تو ار اپنے ماں باپ کے ساتھ گزارتا اور جب باجرے کی فصل سے چڑیاں اڑانے کے لیے اپنی ماں کے ساتھ اوپنچے اوپنچے ”ہو ہو“ پکارنے لگتا تو پیر بخش کہتا ”تمیں بیٹھا تو ایسا کہتا ہوا اچھا نہیں لگتا۔ نیک بخت بھی کہتی“ تو میرے ساتھ مت پکارا کرچے، تو تو منشی بنے گا۔“

جیب احمد منشی تو نہ بنا، البتہ دو کاندار ضرور بن گیا۔ پہلے نمک مرچ اور گز شکر کی دکان کھوئی، پھر کپڑا لے آیا اور ساتھ ہی شہر سے ”ملک جیب احمد براز“ کا بورڈ بھی لکھوا لایا۔ تین چار سال کے اندر اس نے اتنا منافع کمایا کہ گاؤں کے رہنماؤں میں گنا جانے لگا۔ پھر رئیسی کو مکمل کرنے کے لیے اس نے باپ کی منت کر کے ہل بنتل بکوادیئے اور زمینیں مزاروں کے حوالے کر دیں۔ اس کے گھر میں میز کر سیاں آگئیں۔ وہ ریڈ یوکا بیٹری سیٹ بھی خرید لایا اور اس کے مکان کی چھت پر لگے ہوئے ایریل کے بانسوں کو قلعوں پر لہراتے ہوئے شاہی پر چھوٹوں کی سی حیثیت حاصل ہو گئی۔

کھات سے کری پر مختل ہو جانے کے بعد نیک بخت کو جیب احمد کے لیے ایسے ایسے رشتہ پیش کیے گئے کہ وہ لڑکی کے باپ کا نام سنتی تھی تو اسے چکر آ جاتے تھے مگر جب اپنی کرسیوں میزوں اور پڑھتیوں پر بجے ہوئے چینی کے برتوں اور بیتل کے طشتیوں کی دیکھتی تھی اور ادھر سے ریڈ یوکا بولتا تھا ”ہم لا ہور سے بول رہے ہیں“، تو نیک بخت نفی میں سر ہلا کرنا توں سے کہتی تھی ”پاگل ہوئی ہوؤہاں سے چلی تھیں تو یہ بھی سوچ لیا ہوتا کہ کس کے گھر چلی ہو۔ میں تو کوہ قاف کی پر یاں بھی اپنے چپے پر سے قربان کر دوں۔“

پھر اسے وہ پیغام بھی مل گیا جس کا اسے انتظار تھا۔ گاؤں کے سب سے بڑے رہنمیں نے، جس کے کھیتوں میں پیر بخش نے بھی برے وقوٹوں میں ہل چلا�ا تھا، ایک روز خود آ کر اس سے بات کی اور جب پیر بخش نے نیک بخت کو بتایا تو اسے مارے خوشی کے غش سا آنے لگا۔ پھر بڑے دھوم دھڑکے سے یہ شادی ہوئی اور شادی کے چوتھے ہی دن نیک بخت سے دہن کے برتن ٹوٹ گئے۔

اپنی پرانی ڈھوک میں آ کر نیک بخت کوٹھے میں جھاڑو دیتی رہی اور روٹی رہی اور کھانستی رہی۔ اور پیر بخش باہر بیٹھا اپنی ڈازھی میں

انگلیاں ڈالے اپنے قدموں میں بچھے ہوئے ان کھیتوں کو دیکھا رہا جن کے ذرے ذرے کواس کے مل کی پھال میسیوں مرتبہ الٹ چکی تھی،  
مگر اب اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ دلیس نکالے کے بعد کسی اجنبی دلیس کی سرز میں کوچکلی بار دیکھ رہا ہے۔

کسانوں کی ڈھونکیں دور دور بکھری ہوتی تھیں مگر شام تک سب کو پتہ چل گیا کہ پیر بخش اور نیک بخت گاؤں سے اٹھ آئے ہیں۔  
دوسرے دن سورے سویرے ہی ان کے ہاں کسان عورتوں اور مردوں کا ہجوم لگ گیا۔ سب کہتے کہ شیخ ہے شادی کے بعد بیٹھے کے دو  
تلکڑے ہو جاتے ہیں اور ماں گیس اپنے پورے پرانے بیٹھے کے لیے باہیں پھیلائے رہ جاتی ہیں مگر شادی کے دو سویں دن ہی وہ یہاں کیوں  
چلے آئے۔ ابھی تو ہبھن کی متعلقیوں پر مہندی کا رنگ موجود ہو گا۔  
پیر بخش کہتا رہا ”تمہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ حکیم نے نیکاں کو کھلی ہوا میں رہنے کے لیے کہا ہے۔ کچھ دن یہاں رہیں گے پھر چلے جائیں  
گے۔“

نیک بخت بھی پیر بخش کی فصیحت کے مطابق سب سے بھی کہتی رہی مگر جب ان کے دو مزارعے آئے اور انہوں نے پوچھا ”ہمارے دس کوئی  
کام ہو تو بتائے“ تو نیک بخت ضبط نہ کر سکی۔ زور سے رو دی اور میں کے انداز میں بولی ”ہم سے کیوں پوچھتے ہو۔ جاؤ جسے سے پوچھو جس  
نے ماں باپ کو بیوی کر بیوی خریدی ہے۔“

اور جب نیک بخت نے یہ کہہ کر اوپر دیکھا تو اس کے سامنے جبیب احمد کھڑا تھا۔ اس نے کہا ”ماں! کچھ میری عزت کا تو خیال کراو۔“  
نیک بخت جو بیٹے کو دیکھ کر سنائے میں آگئی تھی اس بات پر ترپ اٹھی ”تیری عزت!..... اور کیا ہماری کوئی عزت نہیں ہے؟ کیا اپنی  
عمر بھر کی کمائی کی طرح ہم نے اپنی عزت بھی تیری شادی میں اڑا دی ہے؟ میں تجھے یہاں اپنی کوکھ میں نو مہینے اٹھائے پھری ہوں۔“ نیک  
بخت نے زور زور سے ہاتھ مار کر اپنا پیٹ بجا یا۔ ”میں نے تجھے جنابے لڑکے اور تو میرے سامنے اپنی عزت کا رو تارو نے آیا ہے؟“  
پیر بخش سامنے آ کر بولا ”پھر وہی ہو کا دینے لگیں؟“

”چل وے چل۔“ نیک بخت اس کی طرف اپنا ہاتھ خنجر کی طرح بڑھا کر بولی اور رو تی ہوتی کوٹھے کے اندر چلی گئی۔  
”میں تو ماں! تم دونوں کے لینے آیا تھا۔“ جبیب احمد نے جاتی ہوئی نیک بخت سے کہا۔ ”مگر تم نے میرے منہ پر جوتے مارنے کے لیے  
یہاں پورا جلسہ بلار کھا ہے۔“

”ابھی ہم مرے نہیں پہن۔“ نیک بخت دروازے میں سے پکاری۔ ہم مر جائیں اور بیوی تھیں اجازت دے دے تو ہماری لاشیں لے  
جانا۔ اس سے پہلے تو ہم نہیں آ جائیں گے۔ جا!“

”تیر تو دماغ چل گیا ہے۔“ پیر بخش ملامت کرتا ہوا بیوی کی طرف بڑھا اور جب پلنا تو جبیب احمد ڈھیری پر سے تیز تیز اترا جا رہا تھا۔

چند روز کے بعد نیک بخت بیمار ہوئی تو حبیب احمد بار بار گاؤں کے معتبروں اور ایک بار تو اپنے خسر کی ساتھ لے کر ڈھونک پر آیا کہ ماں اور بابا کو گاؤں واپس لے جائے گر نیک بخت برا بنا کرتی رہی۔ پھر وہ ایک صبح کو مر گئی اور جب حبیب احمد اور دوسرے رشتہ دار اس کی میت کو اٹھا کر گاؤں لے جانے لگے تو پیر بخش بغیر کسی کو کہے چپ چاپ ان کے ساتھ ہولیا۔

نیک بخت کا جنازہ گھر میں داخل ہوا تو اسے اپنی ہی ایک پرانی بات یاد آگئی۔ نیک بخت جب جوان تھی اور ذرا ذرا اسی بات پر رودینے میں بہت تیز تھی تو پیر بخش اس سے کہا کرتا تھا ”بس یہی کھل کر رونے والا معاملہ ایسا ہے جس میں عورتیں مردوں سے زیادہ آزاد ہیں ورنہ رونے کو مردوں کا بھی حق چاہتا ہے۔“ نیک بخت اس بات پر آنسوؤں میں مسکرانے لگتی۔ مگر اب تو وہ مر چکی تھی۔ اب تو اگر وہ حق مج روبھی دینا تو اس پر پیار سے مسکرانے والا کوئی نہ تھا۔ پھر اپنی بیوی کی موت پر کبھی کوئی شوہر بر سر عام رو یا کہ پیر بخش روتا۔ البتہ یہ دیکھ کر اسے سکون سامنے ہوا کہ چلو حبیب احمد تو رورہا ہے۔ نیک بخت اگر ایک بیوی تھی تو ایک ماں بھی تو تھی۔ اس کی قبر کا ایک حصہ تو مخدڑا رہے گا۔

کفن دفن کے بعد حبیب احمد اور وہ صحن کے ایک طرف، جہاں بیٹے کی شادی کے بعد پیر بخش اور نیک بخت کے کھنولے پچھتے تھے، چھٹائیاں پھیلا کر بیٹھ گئے اور فاتحہ خوانوں کی مدارات میں لگ گئے۔ شام کو جب کسی رشتہ دار کے ہاں سے کھانا آیا تو پیر بخش یہ دیکھ کر ایک لمحے کے لیے نیک بخت کی موت تک بھول گیا کہ اس کا بیٹا کو زہادا ٹھاکر اس کے ہاتھ دھلا رہا ہے۔

عشاء کی اذان کے بعد جب ماتم کرنے والی عورتیں چلی گئیں اور پیر بخش اپنے بیٹے اور بہو کے پاس اکیلا رہ گیا تو حبیب احمد اس کے پاس آیا۔ کچھ دیر اس کے پاس چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر رونے لگا اور اس کے گھنٹے پکڑ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”مجھے معاف کرو بابا۔ اماں نے مجھے بتیں دھاریں نہیں بخشنیں مگر قیامت کے دن میں اس سے بخشوں لوں گا۔ بس تم من جاؤ تو ماں بھی من جائے گی۔“

یک یک پورے دن کارکا ہوا غبار پیر بخش کی آنکھوں میں سے ایک طوقان کی طرح پھٹ پڑا۔ حبیب احمد بھی اس کے ایک گھنٹے پر ہاتھ رکھ کر روتا رہا۔ پھر بہت زیادہ رونے کی وجہ سے پیر بخش کے ہاتھ پیر مخدڑے ہونے لگتے تو حبیب احمد پکارا ”ادھر آخاتوں! بابا کے تکوے مل“

نیک بخت کی موت کے بعد خاتون پہلی بار پیر بخش کے سامنے آئی اور پیر بخش نے دیکھا کہ وہ رورہی ہے۔ پھر وہ اپنے سرکی چادر کا گولا بنایا کر پیر بخش کے تکوے اس زور سے رگڑنے لگی کہ اس کے کھلے بالوں نے بکھر کر اس کے آدھے چہرے کو ڈھک لیا۔ ادھر حبیب احمد بھی اسی تیزی سے باپ کی ہتھیاریاں مل رہا تھا۔ یک یک پیر بخش کو محسوس ہوا کہ وہ دنیا کا خوش قسم ترین باپ ہے۔ اس نے سکون کی ایک لمبی سانس لی اور آنکھیں بند کر لیں۔ اگرچہ قبر میں نیک بخت کی یہ پہلی رات تھی مگر پیر بخش بیٹے کی شادی کے بعد پہلی بار آسودگی کی نیند سویا۔ موت کے بعد پہلی جعرات تک حبیب احمد نے دکان بند رکھی۔ وہ دن بھر گھر میں بیٹھا قرآن شریف پڑھتا رہتا اور باپ کو پانی پینے

کے لیے بھی اٹھنے نہ دیتا۔ چار پائی پر ہدی وہ باپ کے ہاتھ دھلاتا۔ پھر خاتون کھانا اٹھا لاتی اور ایک بار ایسا بھی ہوا کہ کھیاں اڑانے کے لیے وہ اپنی چادر کے پلوسے پکھا کرنے لگی۔ صحن کے ان گوشوں کو دیکھ کر پیر بخش کا کئی بار روئے کو جی چاہا جہاں میک بخت نے چڑھتے کاتے اور اپنے تھوپے تھے، مگر بیٹے اور بہو کے سلوک نے اس کے آنسو جذب کر لیے تھے۔ وہ پرانی یادوں پر بس ایک آدھا آہ بھرنے پر اکتفا کرتا تھا اور پھر بیٹے یا بہو سے باتیں کرنے لگتا تھا۔ ”چوہبے سے ذرا بہت کربیٹھ بیٹی، آٹھ سے رنگ جل جاتا ہے۔“ ”جعے کو دکان ضرور کھول لینا بیٹی۔ تجھے نقصان ہو رہا ہے۔“

حبيب احمد نے بڑے شاخہ کی جمعرات کی۔ آدھا گاؤں کھانا کھانے آیا۔ حافظوں نے اخبارہ ختم مرحومہ کی روح کو بخشی جن میں دو ختم حبيب احمد کے اور دوں پارے خاتون کے بھی شامل تھے۔ دور دور سے منگتے آئے اور پیٹ بھرنے کے بعد کھانے سے جھولیاں بھی بھر کر لے گئے۔ پیر بخش صحن کے ایک طرف کرسی پر بیٹھا تھے پیتا رہا اور نمایاں غرور کے ساتھ سارے کام کی گمراہی کرتا رہا اور ساتھ سوچتا رہا۔ کاش اس وقت نیک بخت ہوتی تو بے چاری کتنی خوش ہوتی۔“

صحیح کو حبيب احمد دکان پر چلا گیا تو پیر بخش پر پہلی بار اداسی کا دورہ پڑا۔ نیک بخت اس کے کافنوں سرگوشیاں کرنے لگی اور صحن میں ادھر سے ادھر اور یہاں سے وہاں ٹھیلنے لگی۔ پیر بخش کھبرا کر گلی میں آگیا اور موڑ پر بیٹھا لوگوں کو آتے جاتے دیکھتا رہا۔ بڑی بوڑھیاں اس کے پاس سے گزریں تو چپ چاپ بیٹھے ہوئے پیر بخش کو دیکھ کر روئے بیٹھ گئیں اور نیک بخت کی خوبیاں گنانے لگیں۔ وہ پھر اندر چلا آیا۔ بہو چوڑھانے میں بیٹھی کھانا پکاری تھی۔ پیر بھی قریب لا کر اس کے سامنے بیٹھ گیا اور بولا ”بے چاری نیک بخت بھی اسی جگہ بیٹھ کر کھانا پکاتی جہاں تم بیٹھی ہو۔“

خاتون نے کھبرا کر پیر بخش کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف تھا مگر پیر بخش ماضی کی سیر میں مگن تھا بولا ”نیک بخت سے پہلے میری اماں نے اسی جگہ بیٹھ کر چالیس سال تک کھانا پکایا ہے اور میں بیٹھ کر جہاں اب بیٹھا ہوں صد کرتا تھا کہ میرے ہے کے پر اٹھے پر میری مٹھی برابر گھنی ڈالو ورنہ میں اسے کتے کو کھلا دوں گا۔“ پیر بخش پھوپھو کی طرح ہنسنے لگا اور اسے اپنی آواز اجنبی سی لگی کیونکہ بیٹھ کی شادی کے بعد اس نے پہلی بار اپنے آپ کو ہستا ساختا۔ ”گھنی مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔“ اس نے اپنی بھنی کا جواز پیش کرنا چاہا۔

”مگر بابا! آج کل تو گھنی بہت مہنگا ہے۔“ خاتون بولی ”آج کل تو پور بر بر گھنی سے پر اٹھے پکتے ہیں۔“

”نہیں نہیں بیٹی۔“ پیر بخش نے خاتون کے لجھے میں کھکھلی ہوئی سوئی کی چھس محسوس کر لی تھی۔ ”میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ اب تو میں کپا گھنی کھاؤں تو یہاں ہو جاؤں۔ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ زندگی کتنی جلدی کٹ جاتی ہے۔ پرسوں اس چوہبے کے پاس میری اماں بیٹھی تھی، کل نیک بخت بیٹھی تھی، آج تم بیٹھی ہو۔“

خاتون نے ایک بار پھر جھبرا کر پیر بخش کو دیکھا اور بولی "تو یوں کہوتا بابا کہ تمہیں میری موت کا انتظار ہے۔"

پیر بخش کے سینے پر جیسے خاتون نے گھونسادے مارا۔ وہ "ہمیں" کہہ کر رہ گیا۔ پھر مار کھائے بچے کی طرح چکے سے اٹھا۔ چوڑھانے کی حد بندی کی اوٹ میں کھڑا سامنے کی دیوار کو یوں دیکھنے لگا جیسے بہت دور دیکھ رہا ہے۔ اس نے نچلے ہونٹوں کی دانتوں میں دبایا اور اس کی گردش کی ریس پھول گئیں۔ ضبط کی اس کوشش کے باوجود اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور خاتون کے سامنے اتنے بڑے راز کے فاش ہونے کے ذریعے وہ پھر گلی میں آگیا۔ جب حبیب احمد دکان بند کر کے دوپھر کا کھانا کھانے گھر کی طرف آیا تو پیر بخش گلی کے موڑ پر بیٹھا چکلی میں نکالیے مٹی پر لکیریں کھینچ رہا تھا۔

حبیب احمد کے ساتھ وہ گھر میں آیا اور جب حسب معمول اس کے ہاتھ دھلانے گئے اور خاتون نے اسی طرح کھانا لا کر اس کے سامنے رکھا تو اس کی ساری کوفت دور ہو گئی۔ کھانے کے بعد وہ وہیں چار پائی پر بیٹھا حصہ پینے لگا۔ حبیب احمد واپس دکان پر چلا گیا تھا اور خاتون چوڑھانے میں بیٹھی برتن دھو رہی تھی جب وہ پکارا "میں! حصہ کے لیے اپلے کی آگ تو انھالا۔ غصہ اہونے لگا ہے۔"

"میں برتن دھو رہی ہوں۔" خاتون بولی۔

"چھٹے سے انھالا۔" پیر بخش نے کہا۔

برتن زور سے بجے جیسے ایک دوسرے پر دے مارے گئے ہوں۔ پھر خاتون چھٹے میں اپلے کی آگ انھائے چوڑھانے میں سے نکلی۔ مگر اس طرح نکلی کہ پیر بخش آگ کے بجائے خاتون کے چہرے کو دیکھا رہ گیا۔

خاتون نے آگ کو چھٹے سمت پیر بخش کے جو توں کے پاس پھینک دیا اور واپس چوڑھانے میں گئی تو ایک بار پھر برتن زور سے بجے۔ پیر بخش حصہ پینا بھول گیا۔ آگ وہیں پڑے پڑے راکھ ہو گئی۔

شام کو جب حبیب احمد دکان بند کر کے گھر واپس آیا تو پیر بخش گلی کے موڑ پر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ "دیکھ جیب!" اس نے بینے کا ہاتھ پکڑ لیا اور دن کے دونوں واقعات سنادیے۔ حبیب احمد چپ چاپ کھڑا استمارہ۔ پھر ہاتھ چھڑا کرتیزی سے گھر میں داخل ہو گیا۔

پیر بخش خاصی دیر وہیں گلی میں کھڑا رہا۔ مدتوں کے بعد اسے اپنی بہن یاد آئی کہ زندہ ہوتی تو یہاں سے سیدھا اس کے پاس چلا جاتا۔ بینا بھی اندر جا کر اسے بھول گیا تھا۔ ایک بار اس کا جی چاہا کہ بینے کو آزمائے۔ بینیں بیٹھ جائے اور اگر بینا اسے بلا نہیں آتا تو رات بھر بینیں بیٹھا رہے۔ وہ دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا اور سامنے دیکھا تو اپنے مکان کی چھت پر ایریل کے دونوں بانس اندر ہیرے آسمان کے پاس منتظر میں اسے یوں پھیلے پھیلے نظر آنے لگے جیسے خاتون اور حبیب احمد کھڑے اس کو دیکھ رہے ہیں۔ وہ روٹھے ہوئے بچے کی طرح سست کر دیوار میں گھس جانا چاہتا تھا کہ اچانک گلی کے ایک طرف سے اسے دوآدمی باتیں کرتے ہوئے سنائی دیئے۔ وہ ادھر ہی آرہے تھے۔ پیر

بیرون گھبرا کر اٹھا اور تیزی سے گھر کے صحن میں داخل ہو گیا۔ اس وقت جبیب احمد دیوار کے ساتھ سائے کی طرح لگا کھڑا تھا اور خاتون چولے میں جلتی ہوئی آگ کو گھورے جا رہی تھی۔

بیرون گھش کو ایسا لگا کہ اس نے گھر کے باعینچے کے سارے پھول نوچ کر چینک دیئے ہیں اور ہر طرف پودوں کے ننگے خبر اگے ہوئے ہیں۔ سنائے کوتوزنے کے لیے وہ اپنی چار پائی کو گھینٹا اس گوشے میں لے آیا جہاں جبیب احمد کی شادی کے بعد نیک بخت اور اس کے کھولے رکھے رہتے تھے اور جہاں فاتح خوانوں کے لیے چنانی بچھی تھی۔

اس رات کھانا بھی کسی نے نہ کھایا۔ بیرون گھش قریب قریب ساری رات جاگتا رہا۔ کبھی غنوڈی بھی چھائی تو اس کے کان جاتے رہے۔ وہ بار بار چونک کریوں سراخا لیتا تھا جیسے چولھانے سے پرے اس نے کسی کی ٹھنڈی کی آواز سنی ہے۔ شروع رات میں خاتون کی چند سکیوں کی آواز ضرور آئی تھی مگر اس کے بعد ایسی خاموشی چھائی کو دیر تک کسی آواز کا انتظار کرتے کرتے بیرون گھش کو خاموشی سے خوف آنے لگا تھا اور اس نے کھانس کھکھا کر اپنی ڈھارس بندھائی کہ ابھی قیامت نہیں آتی۔ ایک بار اس کا یہ بھی تھی چاہا کہ چپکے سے کھاث سر پر رکھے اور ہمیشہ کے لیے کھیتوں میں جا بے مگراب کھیت بھی تو جبیب احمد کے تھے۔ اور پھر کہیں نکل جانے سے پہلے وہ جبیب احمد اور خاتون کو ایک دوسرے سے پیار کی باتیں کرتے بھی سنتا چاہتا تھا۔ یہ تھیک ہے کہ بیٹھنے نے باپ کی شکایت کا کوئی جواب نہیں دیا تھا اور حد یہ ہے کہ اس سے کھانے تک کوئی نہیں پوچھتا تھا، مگر آخر جبیب احمد اور خاتون میاں بیوی تھے اور جب میاں بیوی خفا ہوتے ہیں تو انہیں اپنے سوا کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ بیرون گھش کی بے چینی اس وقت انتہا کا پہنچ جاتی تھی جب اسے محبوس ہوتا تھا کہ یہ سنائا اسی نے پیدا کیا ہے۔

ایک بار نیک بخت اس سے روٹھ گئی تھی تو اسے زندگی سے کتنی نفرت ہو گئی تھی۔ اس روز اس نے نماز بھی نہیں پڑھی تھی۔ وہ پھر تک وہ گلیوں میں بے مقصد گھومتا پھر اتھا۔ پھر وہ بکریوں کے لیے صحن میں اگی ہوئی بیری کی شاخصیں کاٹ رہا تھا کہ اس کی ہتھیں میں کاشا چجھ گیا تھا اور نیک بخت کو جو دیوار سے گلی چھاچ میں گندم پھٹک رہی تھی، نہ جانے کیسے معلوم ہو گیا تھا کہ بیرون گھش کے کاشا چجھ گیا ہے۔ وہ تو اس کی طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ بہر حال وہ ایک دم اٹھی تھی اندر سے سوئی لے کر اس کی طرف پکی تھی۔ بیرون گھش بھی یہ دیکھ کر نیچے اتر آیا تھا اور نیک بخت نے اس کی ہتھیں کو اپنے ہاتھ میں لے کر نٹا ہوا کاشا کا لاتھا اور بولی تھی ”جب تجھے کاشا چجھنے لگے تو مجھے پکار لیا کر میرے ہوتے تیری قسمت کا کاشا بھی میرے حصے کا کاشا ہے۔“ اس کے بعد دونوں نے قسم کھائی تھی کہ وہ ایک دوسرے سے کبھی نہیں روٹھیں گے۔ بیرون گھش کو یہ واقعہ یاد آیا تو اسے ایسا لگا جیسے وہ خود بیری کا درخت ہے جس میں پتوں کی جگہ بھی کانے لٹکے ہوئے ہیں اور اس نے اپنے بیٹھے اور بہو کی بھتیلیاں چھٹتی چھٹلی کر رہا ہیں۔

گھبرا کر اس نے اپنی باؤں کو ہاتھوں سے رگڑا اور چولھانے کی پری طرفی کوئی آواز سننے کے لیے سراخا لیا۔ مرغے باگ دینے لگے تھے اور تاروں بھرے آسمان کی سیاہی پچھلی پڑے گئی تھی۔

مسجد سے اذان کی آواز آئی۔ وہ کلمہ پڑھ کر انھا اور یک ایک اسے محسوس ہوا کہ اس کی تو آنکھیں جل رہی ہیں اور سر گھوم رہا ہے اور دل شخشوں اور پیٹ اور کنپٹیوں تک میں زور زور سے نج رہا ہے۔ کوزہ چولھانے کی حد بندی پر رکھا تھا۔ وہ چجنوں کے بل چلتا وباں تک گیا اور کوزہ انھیا تو جبیب احمد کی آواز آئی۔ ”انھے گئے بابا۔“

”کوزے میں پانی ہے کہ بھروں؟“ اس نے پوچھا۔

پیر بخش نے کوزہ چھلکا کر کہا۔ ”ہے۔“

پیر بخش پلٹا تو جبیب احمد نے خاتون سے کہا ”ستی ہو؟ صحیح ہو گئی۔“

”میں تو کب کی جاگ رہی ہوں۔“ وہ بولی۔

”تو کیا میں سورہ تھا؟“ جبیب احمد بولا۔

پھر جانے جبیب احمد نے خاتون کے گدی گدی کی یا کیا ہوا خاتون دبے دبے ہنسنے لگی اور ایک بار جبیب احمد بھی ذرا سا بہسا۔

پیر بخش کو میاں بیوی کی اسی بات چیت اور اسی فہری مذاق کا انتظار تھا مگر اچانک جیسے اس کی بے خبری میں اس کے سینے کے اندر کچھ ٹوٹا اور اسے اپنے بیٹے پر غصہ آنے لگا جس نے باپ کو طاق پر رکھ کر بیوی سے صلح کر لی تھی۔ مگر کیا دونوں کی لڑائی بھی ہوئی تھی؟ کیا وہ اس قابل ہے کہ اس کا بیٹا اس کی خاطر اپنی بیوی سے لڑ بیٹھے؟

جبیب احمد اور خاتون باتیں کر رہے تھے اور نہس رہے تھے۔ آخر وہ اس وقت کیا باتیں کر رہے تھے۔ اور کیوں نہs رہے تھے؟ وضو کرتے ہوئے اس نے اپنی باتھوں اور بازوؤں کی جلد کا ڈھیلا ڈھالا پن محسوس کیا اور اسے قیصیں سا ہونے لگا کہ اس کی بہو اور بیٹا اسی پر اس کے بڑھاپے پر اور اس کے بڑھاپے کی بے بسی پرانیں رہے ہیں۔

یہ سوچتے ہی کوزہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا اور ٹوٹ گیا۔ جبیب احمد اور خاتون پلنگوں پر سے کوڈ کر اترے اور ٹوٹے ہوئے کوزے کے پاس ایک مجرم کی طرح بیٹھے ہوئے پیر بخش کو دیکھ کر واپس چلے گئے۔

اچھا ہوا کہ خاتون خاموش رہی۔ پیر بخش نے سوچا۔ یہ تو بہت اچھا ہوا مگر جبیب احمد کی خاموشی کا تو یہ مطلب تھا کہ اسے کوزے کا ٹوٹنا برالگا ہے۔ کوزہ جو آج بھی چار پیسے میں آتا ہے اور جو نیک بخت نے اچھے وقوں میں ایک لپ باجرہ دے کر خریدا تھا۔

ابھی ایک پاؤں دھونا باقی تھا مگر پیر بخش نے دوسرا کوزہ مانگنے کی جرأت کی اور نہ گھرے میں سے چلو بھر پانی کٹورے میں نکالنے کا حوصلہ کیا۔ ایک پاؤں پر سُج کر کے اس نے نماز پڑھی اور جب پڑھ چکا تو حیران رہ گیا کہ اسے نہ توانیت کرنا یاد تھا اور نہ رکوع اور سجدے۔ اور وہ ایک مشین کی طرح نماز کے بعد کا وظیفہ پڑھ رہا تھا۔

جبیب احمد کے دکان دا نے کا وقت قریب آرہا تھا مگر اب تک وہ باپ کے پاس کل شام کی شکایت کا جواب لے کر نہ آیا تھا۔ پیر بخش  
تبیع پر سبحان اللہ سبحان اللہ کو ورد کر رہا تھا اور ایک بار جب سویں منکے پر پہنچنے والا تھا تو اس پر انشاف ہوا کہ وہ جبیب جبیب کی رث لگائے  
ہوئے ہے۔ تبیع کو جب میں رکھ کر وہ باہر نکل گیا کہ شاید یہاں گھر میں جبیب احمد اپنی بیوی کے ذر سے بات نہ کر رہا ہو۔ پہنچ دیر کے بعد  
جبیب احمد دکان جانے کے لیے باہر آیا۔ باپ کو دیکھا اور بولا "بابا!"

"بیٹا۔" پیر بخش نہایت شوق سے اس کی طرف بڑھا۔

"آج تم نے حق کیوں نہیں پیا بابا؟" جبیب احمد بولا۔

پیر بخش اس سوال کے جواب میں کوئی ایسی بات کہنا چاہتا تھا جس سے شکایت کا کوئی پہلو نکلے اور وہ اپنے کل شام کے گلے کا جواب  
حاصل کر سکے "تمہیں کیسے خیال آیا میرے حق پینے کا؟" پیر بخش نے کہا مگر بعد از وقت کہا کیونکہ جبیب احمد تو اس سے پہلے ہی شاید حقہ تیار  
کرنے کے لیے واپس گھر میں داخل ہو گیا تھا۔

پیر بخش بھی اندر چلا آیا۔ اس وقت جبیب احمد چولھا نے میں بیٹھا چمٹنے کی مدد سے حق پر آگ بھار رہا تھا اور خاتون کہنوں کو گھنٹوں پر  
رکھے اور اٹھے ہوئے بازوں میں اپنا سر تھا میں بیٹھی تھی جیسے جو کچھ اس کو شوہر کر رہا ہے اس سے خود اس کا کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔  
پیر بخش کو ایک ترکیب سو جبھی۔ بولا "میرے کپڑے بڑے میلے ہو رہے ہیں۔ دو پھر کو ایک بھی صابن لیتے آتا۔ میں کنوں پر جا کر دھولاوں  
گا۔"

"نہیں بابا!" جبیب احمد چونکہ کپڑے گھر میں داخل جائیں گے۔"

پیر بخش کا سکرانے کو جی چاہا۔ اس نے خاتون کو دیکھا جو اسی حالت میں بیٹھی چولھے کو گھور رہی تھی۔ وہ اسے ایک چھوٹی سی شرمیلی سی لڑکی لگی۔  
جبیب احمد نے اسے سمجھا دیا ہو گا۔

پیر بخش نے اپنے آپ کو سمجھا لیا تھا اس لیے سکون سے بیٹھا تھا پیتا رہا۔ جبیب احمد دکان پر جا چکا تھا اور خاتون چولھا نے میں بیٹھی دو پھر کا  
کھانا پکانے کی تیاری کر رہی تھی۔ پیر بخش اپنے کوٹھے میں گیا۔ بستر میں سے کھیس لکال کر تہبند کے طور سے باندھا اور چولھا نے میں آ کر  
اپنے میلے کپڑے خاتون کے سامنے رکھ دیے۔

خاتون ایک دم بولی "میں انہیں کیا کروں؟"

"دھونے ہیں۔" پیر بخش بولا۔ "ابھی ابھی جبیب نے کہا تھا نا کہ گھر میں داخل جائیں گے۔ سو گھر میں جبیب تھوڑی دھونے گا، تمہی دھوو  
گی۔"

”مجھ سے نہیں دھلتے۔“ خاتون نے ایک کپڑے کو مرے ہوئے چوبے کی طرح چکلی سے اٹھا کر چھوڑ دیا۔ ”بھی دھویں ہو تو دھلیں۔“ ”تو پھر کون دھوئے؟“ پیر بخش نے پہلی بار آواز میں سختی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

”تم دھوو، جیب دھوئے، کوئی دھوئے، بس مجھ سے نہیں دھلتے۔“

اس کے کپڑوں کو پیر بخش کی طرف کھسکا دیا اور ہندیا میں چچپے چلانے لگی۔

پیر بخش کو غصہ آگیا۔ اگر جیب احمد صاف طور سے کہہ دیتا کہ گھر میں دھولیا تو دوسرا بات تھی، مگر گھر میں دھل جائیں گے مطلب تو یہ تھا کہ خاتون دھوو دے گی۔ اس معاملے میں اسے اپنے بیٹے کی حمایت کا یقین ساتھا اس لئے بولا ”تم سے نہیں دھلتے تو مجھ سے بھی نہیں دھلتے۔“

”مجھ سے تو نہیں دھلتے۔“ خاتون نفرت سے بولی۔

”میں جا کے جیب کو بتاؤں گا۔“ پیر بخش نے دھمکی دی۔

اور خاتون نے یکا یک کھڑے ہوا تھو کوٹھوں پر رکھ لیے اور کڑکی ”تو پھر جاؤ، ابھی جا کر بتاؤ۔ میں جانتی ہوں تمہارے بیٹے کو۔ زیادہ زبان نہ لڑا اور نہ میرا ابا سارے گاؤں کے سامنے تم دونوں کو جوڑتے لگوائے گا۔“

”جوڑتے لگوائے گا؟“ پیر بخش نے یہ الفاظ یوں دھرائے جیسے اسے یقین نہیں آ رہا ہے کہ اس نے یہی الفاظ سنے ہیں۔ ”میں سانچھ سال کا ہو گیا ہوں لڑکی! اور میں نے جوتے ووتے کی بات کسی سے نہیں سنی اور نہ سن سکتا ہوں۔ تیرا ابا تو جب آئے گا، آئے گا، میں اس سے پہلے اپنے بیٹے سے تجھے جوتیاں لگواؤں گا۔ بد ذات کہیں کی۔“

ایک جھلکے سے خاتون بھلی اور دھو دھا سے بھری ہوئی صحک اٹھا کر پیر بخش پر دے ماری۔ پیر بخش ایک طرف ہٹ گیا اور صحک کی ٹھیکریاں ادھر ادھر بکھر گئیں۔ پھر خاتون چیخ چیخ کر رونے لگی اور روتے ہوئے گالیوں کا ایک طومار باندھ دیا۔ پھر وہیں ڈھیر ہو کر پاؤں چھٹنے اور بچکیاں لینے لگی۔

پیر بخش نے میلے کپڑے اٹھائے۔ اپنے کوٹھے میں آ کر انہیں پہنا اور اس تیزی سے گھر میں سے لکھا جیسے کوئی اس کے سامنے آیا تو اسے لتا رہتا ہوا گزر جائے گا۔ وہ اسی تیزی سے جیب احمد کی دکان میں داخل ہوا۔ اس وقت وہاں گا کہوں کا ہجوم تھا اس لئے پہلے تو دروازے میں کھڑا ہاپنٹا رہا اور جیب احمد کو دیکھتا رہا جو کپڑا اپنے میں مصروف تھا۔ پھر وہیں ایک طرف بیٹھ گیا۔ آہستہ آہستہ اس کی پھٹپٹی ہوئی مٹھیاں کھلنے لگیں۔ اس کا جزا ہوا جبڑا اڑھیلا ہو گیا۔ اس کے اٹھے ہوئے کندھے گر گئے۔

اور جب کافی دیر کے بعد بھیڑ چھٹ گئی اور جیب احمد نے اس کی طرف دیکھا تو بولا ”ارے بابا! تم بھی بیٹھے ہو؟ کب آئے ہو؟ کیا

بات ہے؟ کیسے آئے؟“

پیر بخش جواب میں ایک پل سنک میٹے اونکی باندھے دیکھتا رہا۔ پھر بولا ”کچھ نہیں بیٹا! اب تمہیں دیکھنے آکلا تھا کہ تم دکان میں بیٹھے کیسے لگتے ہو۔“

جبیب احمد یوں مسکرا یا جیسے شرمارہا ہے۔ پھر وہ حساب کے جھر پر جھک کر کچھ لکھنے لگا۔



# سلطان

دادا کے بائیں پنجے میں سلطان کی کھوپڑی تھی اور دو بائیں میں لاٹھی جو پیڑی کے پکے فرش پر ٹھنڈھن بجے جا رہی تھی۔

سلطان ذرا سار کا تو دادا جلدی سے بولنے لگا۔ ”ہے بابو جی! اندھے فقیر کو.....“

”دنیس نہیں دادا۔“ سلطان بولا۔ ”بابو نہیں ہے۔ مداری کا تماشا ہو رہا ہے۔“

”تیرے مداری کی۔۔۔“ گالی کو مکمل کرنے سے پہلے ہی دادا پر کھانسی کا دورہ پڑا اور وہ سلطان کے سر پر رکھے ہوئے ہاتھ کو اپنے سینے پر رکھ کر کھانسی کے لیے ایک لمبے چکر میں ڈوب گیا۔

جب تک دادا کی سانس معمول پر آئی، سلطان مداری کی نوکری کے نیچے رکھے ہوئے چیخڑوں کو سفید براق رنگ کے دوموٹے موٹے کبوتروں میں بدلتا دیکھے چکا تھا۔

دادا نے اپنا بایاں بازو ہوا میں پھیلا کر پوچھا ”کہاں گیا تو؟“

سلطان نے فوراً اپنا سر دادا کے پنجے میں تھما دیا اور وہ پیڑی پر جلنے لگے۔

ایک جگہ دادا کی لاٹھی بکھلی کے کھبے سے ٹکرائی تو کھمانج اٹھا اور سلطان بولا ”دادا!؟ کھما کیسا بولا؟“

”ہاں“ دادا کے کھبے کو ایک بار پھر بجانے کی کوشش کی مگر نشانہ چوک گیا۔ ”کھبے بولتے ہیں۔ لے ذرا سامجالے۔“

سلطان نے دادا کی لاٹھی کھبے پر ماری اور دادا بولا ”دیکھا؟ جب میں تمہاری طرح چھوٹا سا تھا تو دیر تک کھبیوں پر کان رکھ کھڑا رہتا تھا۔ ان دونوں تمہارے کھبیوں میں تھیں انگریزی بولتی تھیں۔“ پھر دادا نے میموں کی نقش کی:

”یو گلڈ۔ یو بیڈ۔“

”میں میں یو تھیں کھبیوں میں؟“ سلطان حیران رہ گیا۔ ”آج کل کون بولتا ہے دادا؟“

پھر ایک دم سلطان کا لجہ بدلا اور اس نے سرگوشی میں دادا سے کہا دو بایا رہے ہیں دادا“

دادا جلدی جلدی بولنے لگا۔ ”ہے بابو جی! اندھے فقیر کو راہ مولا ایک روٹی کے پیسے دیتے جاؤ۔ اللہ تمہیں ترقیاں دے۔ اللہ تمہیں بیٹے اور پوتے دے۔“

ایک بابو قہہ مار کر بولا ”یہ بڑھا تو خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف پروپیگنڈا کرتا پھرتا ہے۔“ پھر دونوں زور زور سے ہنستے ہوئے گزر

”چلے گئے!“ سلطان نے آہتہ آہتہ سے کہا۔ پھر ذرا سار کر اس نے بابوؤں کو گالی دے دی۔

دادا نے اپنے پنجے کو سلطان کی کھوپڑی پر دبایا۔ ”پھر وہی بک بک۔

کل کیا کہا تھا میں نے؟ کبھی کسی نے سن لیا تو ادھر کا منہ ادھر لگا دے گا۔“

سلطان چپ چاپ دادا کے ساتھ چلنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد بولا ”میرے سر پر جہاں تمہارا انگوٹھا ہے تا دادا! وہاں ذرا سا کھجاؤ۔“

دادا نے اپنا انگوٹھا سلطان کی کنٹھی پر زور سے رگڑا۔

”سلطان!“ خاصی دیر کے بعد دادا بولا۔ ”کیا بات ہے؟ آج تو تم کہیں رکتے ہی نہیں۔ آج باپولوگ کہاں چلے گئے؟“

”مر گئے“ سلطان نے جواب دیا۔ پھر یکا یک رک گیا اور بولا ”آج کون سادا ہے دادا؟“

”میں کیا جانوں میٹا۔“ دادا بولا۔ تم دن یاد رکھا کروتا۔ میرے لیے تو دن رات دونوں برابر ہیں۔“ دادا نے ذرا سار کر سوچا۔ پھر بولا ”پرسوں تم مجھے نیلا گنبد کی مسجد لے گئے تھے تا؟ پرسوں جمع تھا۔ اس حساب سے تو آج اتوار ہے۔ بیڑہ غرق ہواں اتوار کا۔ آج تو بابوں لوگ اپنے گھروں میں بیٹھے یہوی پچوں سے کھیل رہے ہوں گے۔“

سلطان دم بخود کھڑا رہ گیا جیسے کوئی زبردست حادثہ ہو گیا ہے۔

اچانک ٹن کی آواز آئی۔ کسی راہ چلتے نے سلطان کے ہاتھ کے کھورے میں ایک پیسہ ڈال دیا تھا۔

”کچھ ملا؟ کیا ملا؟“ دادا نے پوچھا۔

”ایک پیسہ ہے۔“ سلطان بولا۔ ”چھوٹے والا نئے والا“

دادا نے اپنا اپنا پنجہ سلطان کے سر پر گھما یا ”جا کوئی چیز لے کر کھالے۔ جا میں میہیں کھڑا ہوں۔“

”ایک پیسے کا تو کوئی کچھ نہیں دیتا دادا“ سلطان بولا۔ ”دو تین ہوں گے تو گندزیری کھاؤں گا؟“

دادا نے سلطان کے سر پر سے ہاتھ اٹھا کر جیب میں ڈالا۔ لے یہ دو نئے پیسے کل کے پنجے رکھے ہیں۔ کوئی چیز کھالے۔ تو نے میچ سے کچھ کھایا بھی نہیں۔ پچوں کو تو بڑی بھوگ لگتی ہے جا.....“

سلطان نے پیسے لے لیے تو دادا بولا ”جلدی سے آ جا۔ اچھا میں میہیں کھڑا ہوں، کہاں کھڑا ہوں میں

”ذرا سا بائیں کو ہو جادا دا۔“ سلطان نے دادا کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ”کھبے کے ساتھ لگ جا۔“

”دادا کھبے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ دیر تک یونہی کھڑا رہا۔ پھر وہ کھبے پر کان رکھ کر جیسے کچھ سننے لگا اور مکرانے لگا۔ یکا یک وہ چونک

سامنہ اور سلطان کو پکارنے لگا: سلطان! اے سلطان! ”پھر وہ اسے گالیاں دینے لگا۔ ”اوہ امزادے سلطان! تو کہاں جا کر مر گیا؟ کوئی جواب نہ پا کر وہ ادھر ادھر گوم کر بولا۔ ”اے بھتی خدا کے بندو۔ میرا چھوٹا سا پوتا ادھر کہیں سے پہنچے دو پیسے کی کوئی چیز لینے گیا ہے۔ سلطان نام ہے۔ کہیں ناٹنگ مور کے نیچے تو نہیں آگیا بد نصیب کی اولاد۔ ”پھر وہ چلا یا ”osalatan“ آیا دادا۔ ”دور سے سلطان کی آواز آئی، مگر زور سے چھینٹ کی وجہ سے دادا کے کھانسی چھوٹ گئی۔

دادا کی سانس معمولی پر آنے لگی تو اس نے پلٹ کر جیسے کھبے سے پوچھا ”کہاں مر گیا تھا تو؟“

”سلطان نے دادا کا بایاں ہاتھ اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیا ”ماری تماشہ دھارہ تھا، پیٹ سے گولے نکال رہا تھا۔“ دادا نے اپنے پنج کو سلطان کی کھوپڑی پر یوں دبایا جیسے اسے اوپر اٹھا لے گا۔

”چل گھر چل۔ وہاں میں تجھے ماری کا تماشہ دکھاؤ۔ حر امزادے! نہیں سوچا کہ میں انہاں پانچ یہاں رستے میں کھڑا ہوں۔“ سلطان چپ چاپ چلتے گا۔ کچھ دیر کے بعد دادا نے نری سے پوچھا۔ ”کیا کھایا؟“

”گندیریاں۔“ سلطان بولا۔

”اڑے بد بخت گندیریاں تو پانی ہوتی ہیں۔“ دادا پھر غصے ہونے لگا۔ ”چنے کھالیتا تو دو پھر تک کا سہارا تو ہو جاتا۔“ سلطان چپ چاپ رہا۔

”کثورا ہاتھ میں لڑکا تو نہیں رکھا؟“ دادا نے پوچھا۔ ”نہیں دادا۔“ سلطان بولا۔

”ہاں۔“ دادا نے بڑی نری سے نصیحت کی ”انھائے رکھا کرو۔ لذکار ہے تو لوگ سمجھتے ہیں یہ بھکاری نہیں ہیں۔ سودا لینے چلے ہیں۔“ سلطان چکنے لگا ”ایک بار میں کنورے میں تیل لینے جا رہا تھا تو ایک بابو نے اس میں دو نیڈل دی تھی۔ یاد ہے دادا؟“

”ہاں،“ دادا بولا ”پر ایسا کم ہوتا ہے۔ ایسے بابو کم ہوتے ہیں۔“

”دوا۔“ سلطان نے کہا ”انگوٹھے والی جگہ کو ایک بار پھر کھجاؤ۔“

دادا نے سلطان کی کٹی پر انگوٹھا زور سے رگڑا اور بولا ”آج واپس جا کر میں زیبوبی سے کھوں گا کہ میرے بچے کے سر سے جو بھی چن لے۔ تم بھی اس کا کوئی کام کر دینا۔ بالائی بھر لانا ہل سے۔ اچھا؟“ ”اچھا۔“ سلطان نے جواب دیا۔

گھر واپس آ کر جب سلطان دادا کو کھولے کے پاس لاتا تو کہتا "لے دادا بیٹھ جا۔" دادا کو کھولے کے پائے سے لگا دیتا اور وہ سلطان کے سر پر سے ہاتھ اٹھا کر کھولے پر بیٹھ جاتا۔ سر پر سے دادا کا ہاتھ اٹھتے ہی سلطان کو یوں محسوس ہوتا جیسے ایک دم وہ بہلا کچلا ہو گیا ہے اور اس کے پاؤں میں لو ہے کے گلوں کی جگہ بڑے کے پہنچے بندھ گئے ہیں۔ وہ چپکے سے چھپریا میں سے نکل آتا۔ پھر خالہ زیبو کی آنکھ بچا کر بھاگ نکلتا اور بیٹلوں سے گھرے ہوئے میدان میں پہنچ جاتا جہاں امیروں کے پنج کرست کھیلتے تھے اور غریبوں کے پنج انہیں گنبد اٹھا کر دیتے تھے۔ پھر جب وہ میدان خالی کر دیتے تھے تو یروں خاناموں، چپر اسیوں اور مہتروں کے پنج بلور کی گولیاں کھیلتے تھے۔ ایک بار سلطان نے بھی اس کھیل میں شامل ہونے کی کوشش کی تھی۔ چند روز تک کھیلا بھی تھا مگر پھر ایک دن مہتر کے لڑکے نے اکٹھاف کیا تھا کہ سلطان تو انہے بھکاری کا بچہ ہے۔ جب سے اسے کھیل میں شامل نہیں کیا جاتا تھا۔ البتہ جب کوئی بچہ بلور کی گولی بہت دور پھینک بیٹھتا تو سلطان لپک کر یہ گولی اٹھا لاتا تھا اور مالک کے حوالے کرنے سے پہلے اسے چند بار انگلیوں میں گھما لیتا تھا۔ ایک بار دادا کے سامنے دیر تک زار زار رو کر اس نے چند پیسے حاصل کر لیے تھے اور ان سے بلور کی گولیاں خرید لایا تھا، مگر جب میدان میں پہنچا تھا اور بچوں نے اس کے ہاتھ میں گولیاں دیکھی تھیں تو وہ یہ کہہ کر اس پر جھپٹ پڑے تھے کہ یہ تو ہماری گولیاں ہیں۔ اور بھلا بھکاریوں کے بچوں کے پاس بھی بھی گولیاں ہوئی ہیں! وہ اس دن خوب پاؤں پنج پنج کرو یا تھا، مگر دوسرے دن پھر میدان میں جانکلا تھا۔

ایک بار میدان میں آنے کے بعد اسے واپس گھر جانے سے ڈرگلتا تھا کہ کہیں دادا پھر سے اس کے سر کو اپنے سوکھے ہاتھ میں جکڑ کر اسے سڑک سڑک نہ لیے پھرے۔ اسے معلوم تھا کہ صحیح کو آنکھ کھلتے ہی اسے دادا کے ساتھ گدا کرنے نکل جانا ہو گا۔ اس لیے کھولے سے اٹھتے ہی اسے ایسا لگتا جیسے اس نے پھر کی نوپی پہن لی ہے۔ دادا کے ہاتھ پانچوں انگلیاں دروکی پانچ لہرس بن کر اس کی کھوپڑی میں دوڑ جاتیں اور جب دادا نماز پڑھنے اور دعا مانگنے کے بعد لاٹھی سن جاتا اور سلطان کو پاس بلاؤ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھتا تو سلطان آدھا مر جاتا۔ دادا کا یہ ہاتھ سوتے جا گتے میں اسے بجوت کی طرح ڈراتا تھا۔ یہ ہاتھ سے گرفتار کر لیتا تھا اور وہ پیڑی پر یوں چلتا تھا جیسے ملزم تھکڑیوں پہنے پاہی کے ساتھ چلتے ہیں اور پھر قید خانے کی صدر دروازے کے چنگلے میں سے باہر سڑک پر لوگوں کو چلتا پھرتا ہنستا مسکراتا دیکھتے ہیں، مگر بس دیکھتے رہ جاتے ہیں اور ان کی بصارت کے ساتھ سلاخیں صلپیوں کی طرح چھٹ جاتی ہیں۔

جب دادا کا ہاتھ اپنے سر پر رکھے وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتا تھا تو کئی بار اس کا جی چاہا کہ گندی ری والے کے خواصی میں سے جو گندی ری لڑک کر گندی نالی کے کنارے جا کر رکھنی تھی وہ لپک کر کھالے۔ بابو نے کیا کھا کر جو چھلا کا پھینکا ہے اسے بڑھ کر اٹھا لے اور ذرا سا چاٹ لے۔ مگر جب بھی اس نے کسی بہانے دادا سے ذرا سارک جانے کو کہا تو دادا نے اپنی انگلیاں اس کے سر کی ہڈی میں گاڑ دیں اور وہ بولا "میں تجھے شہلا نے لکلا ہوں کہ تو مجھے گدا کرانے لکلا ہے؟ ارے بد بخت! دن بھر میں چار پانچ آنے کی بھیک نہ ملی تو زیوں دو وقت کی روٹی

ہمیں کیا اپنی گرد سے کھلائے گی؟ اس کی بھی مہربانی کیا کم ہے کہ اس نے ہمارے سرچھپا نے کو اپنی چھپریا دے رکھی ہے؟ کافی دنوں کی بات ہے دادا بنگلے سے بھیک مانگنے کے بعد جب مہتروں کے کوارٹروں کے چیچھے بیگلوں کو چوچان کے گھروندے کے سامنے گزر تو اس کی ماں زیبوپک کے آئی اور بولی "ارے بابا! دعا کر۔ اللہ میرے بیٹے کی پسلی کا درد بخیک کر دے۔ میں تجھے پورا ایک روپیہ دوں گی؟۔"

"دادا نے وہیں کھڑے ہو کر دعا مانگی تھی۔ پھر چند روز کے بعد اس نے سلطان کو دوبارہ انہی بنگلوں کی طرف چلنے کو کہا۔ بھی وہ بنگلوں تک نہیں پہنچ سکتے کہ زیبو نے انہیں رستے ہی میں پکڑ لیا۔ دادا کو ایک روپیہ دیا اور بولی مجھے بتا تو کہاں رہتا ہے بابا! میں جمرات کی جمرات تیری سلامی کو آیا کروں گی۔" پھر جب اسے معلوم ہوا تھا کہ یہ دادا پوتا تو کسی دکان کے چھجھے تلے پڑ رہتے ہیں تو اس نے بیٹے سے کہہ کر چھپریا خالی کر ادی تھی اور جب سے دنوں وہیں رہتے تھے۔ دن بھر کی بھیک اس کو لادیتے تھے اور وہ اسی حساب سے انہیں روٹی پکا دیتی تھی۔ ان دنوں دادا سے وہ اپنے بیٹے کے اولاد ہونے کی دعا کر رہی تھی۔

سلطان کو دادا کے علاوہ خالہ زیبو بھی اچھی نہیں لگتی تھی۔ وہ جب بھی دادا کو واپس چھپریا میں پہنچا کر لکھا تو زیبو سے چھپ کر لکھا اور نہ وہ شور مچا دیتی تھی کہ لو دیکھو۔ اپنے بوڑھے اپانی دادا کو اکیا چھوڑ کر کھینے چلا ہے۔

جس روز داداون ڈھلے ہی تھک کر واپس آ جاتا اور سلطان کو کھک جانے کا موقع نہ ملتا تو ذرا ساستا لینے کے بعد وہ پھر سے لاٹھی سنبھال کر کہتا "چل سلطان! چوک کا ایک اور چکر لگوادے۔ آج کچھ زیادہ مل گیا تو کل تیری چھٹی۔" مگر یہ اچھی بھی نہیں ملتی تھی اس لیے کہ کچھ زیادہ کبھی نہیں ملتا تھا۔

المبتا ب کچھ عرصے سے یوں ہونے لگا تھا کہ دادا کو آدمی رات کے بعد دمے کے دورے پڑتے اور وہ کھانس کھانس اور ہانپ ہانپ کر صحیح نہ کر دھ موہا ہو جاتا۔ اس روز وہ گدا پر نہیں لکھا تھا مگر سلطان کو جب بھی اچھی نہیں ملتی تھی۔ وہ دن بھر بیٹھا دادا کے کندھے اور پسلیاں دباتا رہتا اور اس کے ہاتھر کتے تو دادا کی کھانسی سے بھی خوبی آواز میں پکارتا "کیوں سلطان، کیا کر رہا ہے؟ مر تو نہیں گیا؟"

سلطان فوراً دادا کے کندھے پکڑ لیتا اور جی میں کہتا "اللہ کرے تو خود مر جائے دادا۔ تو مر جائے تو اللہ قسم کیسے مزہ آئیں۔ اللہ کرے تو جلدی جلدی سے بس ابھی ابھی مر جائے اور میں بنگلے کی بی بی سے اس کے بچے کی نوپی کی بھیک مانگ کر اپنا سرڑھانپ لوں۔"

پھر ایک روز دادا بچھی مر گیا۔ وہ ٹوٹی رات تک سر کو گھنٹوں پر رکھ کر کھانستا اور پانچتارہا اور اس کی پسلیاں پھٹکتی اور سمشتی رہیں۔ سلطان اس کے کندھے دباتا رہا اور اس کی ریڑھ کی بڑی کے کناروں کو انگوٹھوں کی پوروں سے سہلا تارہ۔ پھر وہ سو گیا اور جب صحیح کو اس کی آنکھ کھلی تو روٹی ہوئی خالہ زیبو نے اسے بتایا کہ سلطان تیرا دادا تو اللہ کو پیارا ہو گیا۔

ایک ایکی سلطان کے اندر چار طرف پھل جزیراں سی چھوٹیں اور وہ بولا "سچ؟" جیسے اسے یقین نہیں آ رہا کہ دادا لوگ بھی مر سکتے ہیں۔ پھر بیگوں کو چوں آس پاس کے لوگوں کو مجع کر لایا اور وہ دادا کو غسل دے کر دفاتر نے لے گئے۔

خالہ زیبو و فقہے و فقہے سے روتنی رہی اور اس کی بہونے بھی سلطان کو بڑے پیار سے دن بھر اپنے پاس بھائے رکھا۔ بیگوں بھی قبرستان سے واپس آیا تو سلطان کے لیے گندیریاں لیتا آیا اور گندیریاں چوتے ہوئے سلطان نے سوچا۔ جب دادے مر جاتے ہیں تو کیسے مزے آتے ہیں۔

رات بھی خالہ زیبو نے اسے چھپریا میں نہ جانے دیا کہ بچہ ہے، ذر جائے گا۔ صبح کو اس نے سلطان کو رات کی اک چپاتی اور لسی کا ایک پیالہ دیا۔ خوب پیٹ بھر کر وہ اٹھا تو زیبو نے پوچھا۔ "کہاں چلے ہیٹا؟"

سلطان کو یہ سوال بڑا عجیب سا لگا۔ ہم کہیں بھی جا کیں تمہیں کیا۔ ہمارا دادا تو مر گیا ہے۔

سلطان کو خاموش پا کر وہ بولی "تمہیں ہیٹا! بھکاری لوگ کہیتے و پلتے نہیں ہیں۔" پھر وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر چھپریا میں لے آئی اور کثورا اٹھا کر اس کے ہاتھ میں تھما تے ہوئے بولی "بھکاری لوگ بھیک نہ مانگیں تو کھا کیں کہاں سے۔ آج کہیں سے آٹھوں آنے کمالا۔ میں تجھے چاول کھلاوں گی۔ جایا! اسکی آبادی کا ایک پھیرا لگا۔ اللہ تیرا ساتھی ہو۔"

سلطان نے ہاتھ میں کثورا لے لیا مگر چھپریا سے باہر آتے ہی وہ رک گیا۔ واپس چھپریا میں گھسا جیسے کچھ بھول آیا ہے۔ پھر وہ بلبلہ کر دیا اور خالہ زیبو کے پھیلے ہوئے ہاتھوں سے کتر اکر بھاگ لگا۔

اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا جب اس نے سڑک پر ایک بابو کے سامنے کثورا پھیلایا۔ "بابو جی! اندھے فقیر کو راہ مولا ایک روٹی۔" اس نے زار زار روتے ہوئے دادا کے الفاظ دہرا دیے۔

"کیا تو اندھا ہے؟ بابو نے سختی سے پوچھا۔

سلطان کو یہاں یک اپنی غلطی کا احساس ہوا اور گھبرا کر اس نے لفٹی میں سرہلا دیا۔ پھر وہ بچھوٹ پچھوٹ کر رونے لگا۔

"بچھوٹ بھی بکتا ہے اور روتا بھی ہے؟" بابو نے ڈانٹا "نوكری کرے گا؟" اس نے پوچھا اور پھر سلطان کو مسلسل روتا پا کر جانے لگا۔

سلطان رندھی ہوئی آواز میں بولا "ہے بابو جی! راہ مولا پیسہ دو پیسے دیتے جاؤ۔"

بابو پلٹے بغیر آگے بڑھ گیا۔ وہ کافی دور تک گیا تھا جب روتا ہوا سلطان یک ایک اس کی طرف دوڑ نے لگا اور پکارنے لگا۔ "بابوا ہے بابو جی۔"

بابو رک گیا۔ آس پاس سے گرتے ہوئے لوگ بھی ٹھہر گئے۔

”نوكري کرے گا؟“ بابونے پوچھا۔

”بابوجی!“ پانچتا ہوا سلطان بابو کے پاس رکا۔ پھر اس کا نچلا ہونٹ ذرا سائز کا اور وہ بولا ”بابوجی! دیکھئے۔ میں تو کری نہیں مانگتا، بھیک نہیں مانگتا۔“ اس نے کٹورا زمین پر ٹھنڈی دیا۔

”تو پھر مجھے کیوں پکارا؟“ بابونے جمع ہوتے ہوئے لوگوں پر ایک نظر دوز اکر ذرا تلخی سے پوچھا۔

ایک دم سلطان کی آنکھوں میں اکٹھے بہت سے آنسو آگئے۔ اس کے ہونٹ پھر کنے لگے اور وہ بڑی مشکل سے بولا ”بابوجی! خدا آپ کا بھلا کرے۔“

خدا آپ کو بہت دے۔ کیا آپ ذرا دور تک میرے سر پر ہاتھ رکھ کر چل سکیں گے؟“

”لو اور سنو۔“ بابو حمقوں کی طرح جھوم کو دیکھنے لگا۔



## بھاڑا

میں نے اسے بچپن میں بھی دیکھا تھا مگر بچپن میں تو سمجھی خوبصورت ہوتے ہیں۔ بہت کم ایسے ہوں گے جن کے اعضا جوانی کی آنچ میں پھیل نہ جائیں یا لٹک نہ پڑیں۔ ملکھاں انہی بہت کم لوگوں میں سے تھیں۔ چودہ پندرہ برس بعد میں اسے دیکھتے ہی محقق بن گیا۔ یہ دراصل مکاں کا بگاڑ ہے اور مکاں درحقیقت ملکہ ہے۔ اور اگرچہ مکاؤں میں بعض بڑی بدہیت شخصیتیں بھی گزری ہیں مگر ملکہ کے ساتھ حسن کا وصف عموماً بڑی شدت سے وابستہ رہا اور یہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہے۔ لاکھوں کروڑوں عورتوں میں سے اگر ایک عورت کو منتخب کرنا ہو تو بد ذوق بادشاہ سے بھی حسن انتخاب سرزد ہو سکتا ہے۔

ملکھاں فقط حس کے معاملے میں ملکہ تھی ورنہ دراصل وہ جمیع رن تھی۔ میں نے اسے پندرہ برس کے بعد اس وقت دیکھا جب اس کے سر پر پانی سے بھرے ہوئے دو گھنٹے تھے اور وہ باعیسیں ہاتھ کو اوپرواں گھنٹے کے ابھار پر کھے اور داعیسیں ہاتھ کا تموار کی طرح لہراتی، ایک گلی کی بلندی طے کر رہی تھی۔ مشقت کے اس لمحے میں وہ مجھے اتنی خوبصورت لگی کہ اس کے جسم کے خطوط اور چہرے کے نقوش کی طرف میرا دھیان ہی نہ گیا۔ اب سوچتا ہوں تو بس اتنا یاد آتا ہے کہ اس کے اٹھے ہوئے بازو پر سے سیاہ کرتے کی کھلی آستین اس کے کندھے تک ڈھلک گئی تھی اور اس کا سارا خون اس کے چہرے میں مجمع ہو رہا تھا اور اس کی ناک کی نوک اور ٹھوڑی پر پیسے کے دو بڑے قطرے ٹکنے کے لیے بے قرار تھے۔

مگر جب میں نے دو دن بعد اسے تھوڑے کے سامنے بیٹھے دیکھا تو اس کے حسن نے اپنی تفصیل بیان کر دی۔ زمین میں دھنے ہوئے بہت کھلے دھانے والے بڑے سے تھوڑے کے پاس وہ یوں بیٹھی تھی کہ اس کے چیچے دیوار تھی۔ سامنے پاہا ہوا تھا اور تھوڑے کے تین طرف کچے سے کھلے چھوڑتے پر گاؤں کی ایک ڈیڑھ درجن عورتیں صحنکوں میں گوندھا ہوا اثار کھے اپنی اپنی باری کی منتظر تھیں۔

ملکھاں نے اپنے سر چہرے سینے اور داعیسیں بازو پر موئے میلے کپڑے کی چوڑی چوڑی پیالاں لپیٹ رکھی تھیں تاکہ جب روٹی لگانے کے لیے وہ تھوڑیں بھکھتے تو اس کے جسم کے یہ حصے جملنے نہ پا سکیں۔ یوں پیالوں میں لپٹنے ہوئے اس کے چہرے پر اس کی صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں اور یہی آنکھیں اس کے حسن کی تفصیل تھیں۔

ملکھاں کے بچپن کے بعد میں نے گزشتہ پندرہ برس میں چند بارے سے ضرور دیکھا ہو گا ورنہ میں اسے پچھانتا کیسے! اگر یہ دیکھنا کچھ اس قسم کا دیکھنا تھا جیسے ایک مسافر چیت کے مینے میں کھیتوں کی مینڈوں، سبزہ زاروں کی چھر کیوں اور پھاڑوں کی گنڈنڈیوں پر سے گزر رہا ہو

اور دیکھ رہا ہو کہ ہر طرف جنگلی پھول اگ رہے ہیں۔ اگ نہیں رہے ہیں، گابی اور سونی نہیں اور پچھے موتوں کی طرح بکھرے ہوئے نہیں نہیں ذرا ذرا سے پھول جنہیں دیکھ کر مسافر کو اپنا سفر لگلشت معلوم ہو، لیکن جو منزل پر پہنچ کر ان پھولوں کی کوئی تفصیل بیان نہ کر سکے۔ میں مسافر ہی تو تھا جو سال دو سال میں اپنے گاؤں کا ایک آدھ چکر لگایتا تھا۔ اور ملکھاں ہزاروں جنگلی پھولوں میں ایک پھول تھی، اور میں ان پھولوں کے بارے میں یہ کیسے بتا سکتا تھا کہ یہ پھول چار اور وہ پھول پانچ پتیوں پر مشتمل ہے یا اس پھول کی پتیوں کے کنارے گول اور اس کے دندانے دار ہیں۔

اگر یہ بات نہ ہوتی تو اب تک مجھ سے ملکھاں کی آنکھیں کیسے چھپی رہ سکتی تھیں۔ انسان کے جسم سب سے بلند حصہ اس کی آنکھیں ہیں۔ زبان سے جذبات کا اظہار اور ابھی ہو سکتا ہے اور جھونٹا بھی لیکن آنکھیں کبھی جھوٹ نہیں بوتیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں کسی انسان سے ملتا ہوں تو سب سے پہلے میری آنکھیں اس کی آنکھوں کو ڈھونڈتی ہیں۔ ان آنکھوں میں کہیں مجھے سمندر نظر آتے ہیں اور کہیں صحراء۔ کہیں ان میں تارے چمکتے ہیں اور کہیں چراغ بجھتے ہیں۔ ایسی آنکھیں بھی ہوتی ہیں کہ غور سے نہ دیکھو تو گناہ کا احساس ہونے لگے اور غور سے دیکھو تو ڈوب جاؤ۔

اس کے باوجود پندرہ برس بعد جب میں نے ملکھاں کو گلی کی بلندی طے کرتے دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں تک پہنچنے میں خاصی دیرگی اور جب تک میں اس کی آنکھوں میں جھاکتا وہ ”رُد بلا کیس دور بلا کیس“ کے خیر مقدمی الفاظ بلوتی میرے قریب سے نکل گئی تھی۔ لیکن دو دن بعد جب میں نے اسے تھوڑے سامنے پیسوں میں پٹا ہوا دیکھا تو جس طرح اس زور اس کا سارا خون اس کے چہرے میں جمع ہو گیا تھا، اسی طرح آج اس کا سارا حسن اس کی آنکھوں میں رچ گیا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں کو اس کے سارے پیکر سے الگ کر کے دیکھا تو مجھے ان میں دونوں جہان نظر آگئے۔ وہی ابھام جو خمار میکن بھی ہے اور خمار آور بھی۔ اور جب اس نے پلکیں جھپکیں تو جیسے صدیاں گزر گئیں۔

بوزھی عورتوں، جوان لڑکیوں اور کم سن پچیوں کا ہجوم بڑھ رہا تھا۔ بعض آٹا نینیں گوندھری تھیں اور غیر ہموار زمین پر ان کی ٹھنڈیں بخ رہی تھیں اور چوڑیاں سکنگنوں سے بخ رہی تھیں اور بالیاں بالیوں سے بخ رہی تھیں۔

اس مضمون منتشر مگر مسلسل موسیقی میں گمراہ ہوا تھا اور دہکتے ہوئے تھوڑی میں روٹی لگائی جائے تو پھیل جاتی ہے یا لٹک کر گر پڑتی ہے۔ اسی لیے آج میں کمی کا انتظار ہو رہا تھا اور ادھر ادھر کی باتیں ہو رہی تھیں۔

بس اتنی سی دیرگی کہ بچہ ہوا تو سب سمجھیں بھاگاں مر گئی۔ اور جب بھاگاں نے آنکھیں کھولیں تو بچہ مر چکا تھا۔

”ہایچاری کا تیرا تھا۔“

”تیرا کیوں بہن؟ چوتھا کہو۔ شادی سے پہلے والا بھی تو گنو۔“

”خدا کے لیے ماں“ ملکھاں پہلی بار بولی۔ مگر اس کے ہونٹ بھی پیسوں میں چھپے ہوئے تھے اس لیے اس کی آواز بہت دور سے آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ ”خدا سب کے پردے رکھے۔ آہستہ بولا۔ مردلوگ بیٹھے ہیں۔“

میں تو کے چبوترے سے جڑے ہوئے چھپر کے نیچے مردوگوں ہی کے پاس بیٹھا تھا۔ ملکھاں کے شوہرنے مجھے اپنے بھائی کا خط پڑھنے کے لیے گلی میں سے بالایا تھا اور اگرچہ میں خط کب کا پڑھ چکا تھا مگر بیٹھا کا بیٹھارہ گیا تھا۔ یہ نوجوان تھیوں زیوں اطمینان سے حق کے کش لگا کر دھوکیں کو اپنی گھنی موچھوں میں سے گزارتا تھا جیسے تصور کے کنارے اس کی باور دی یہوی نہیں بیٹھی ہے ایک مشین رکھی ہے اور ابھی جب شام گھری ہو جائے گی تو یہ مشین گوندھا ہوا ذہیر سارا آنا اٹھا کر اس کے سامنے لاڈا لے گی۔ وہ جب حق کا دھوکا نکالتا تو قریب ہی کھڑا ہوا اس کا بڑا ایٹھا دھوکیں میں سے بار بار ہاتھ گزار کر دھوکیں کو کائنے کی کوشش کرتا اور کھرے کھنوں لے پر لیٹا ہوا اس کا چھوٹا بچہ زور سے کلاکاری مارتا۔ ”مردلوگ“ بسی انہی چار نفوس پر مشتمل تھے۔

ملکھاں نے قریب رکھی ہوئی دوری میں سے چلو سے پانی لے کر تصور کے چار طرف بار بار چھڑ کا تو تصور اڑ دہے کی طرح بار بار پھنکا را۔ ملکھاں کے قریب بیٹھی ہوئی ایک عورت نے صحنک میں سے آٹے کا پیڑا اٹھا کر ملکھاں کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا اور ملکھاں بولی: ”بسم اللہ الرحمن الرحيم۔“

پیڑے کو دونوں ہاتھوں میں چٹاٹ پٹاٹ بجاتے ہوئے ملکھاں نے کہا۔ ”ذری چھوٹا پیڑا بنا یا کر بگن۔ بڑے پیڑے کی روٹی موٹی بنتی ہے۔ پکھی رہ جاتی ہے اور پھر تم نام دھرتی ہو۔“

پھیلی ہوئی روٹی کو دیکھیں ہاتھ پر پھیلا کر ملکھاں گھٹنوں کے بل ذرا سی اٹھی، پھر جھکی اور تپے ہوئے تصور میں جیسے غائب ہو گئی۔ فوراً بعد وہ ابھری، پھیلے ہوئے ہاتھ ہر دو سرا پیڑا لیا۔ چٹاٹ پٹاٹ روٹی بنا لی اور پھر سے تصور میں جیسے اتر گئی۔

ایک بار نیا پیڑا لینے میں اسے ذرا سی دیرگلی تو میں نے دیکھا کہ تصور میں جھکتے ہی وہ پیش سے بچنے کے لیے اپنی آنکھیں میچ کر ان پر پلکیں پھیلا دیتی اور جب تصور سے ابھرتی ہے اور پیچی ہوئی آنکھیں کھولتی ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے ان میں آگ بھر لائی ہے۔

روٹی کو دیکھیں جانتا کر زمین دھنے ہوئے اتنے کھلے اور اتنے گھرے تصور کے اوپر سے نیچے چار طرف روٹیاں لگاتے ہوئے وہ اپنا توازن کیسے قائم رکھتی تھی۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو میرا دل بار بار کیوں ڈوبتا اور ملکھاں کے شوہر کو یہ کہنے کی ضرورت کیوں ہوتی کہ ”جا لڑ کے! اندر سے پٹکھا اٹھالا اور میاں جی کو جھل۔ پسینے پسینے ہو رہے ہیں۔ دیکھئے میاں جی اروزی کی بات ہے ورنہ میں آپ کی منت کرتا کہ شہر کو گولی ماریے۔ دیکھئے تو آپ کیسے پیلے پیلے بالکل ہلدی سماں ہو رہے ہیں۔“

لڑکا جس میرے پنکھا جھلنے لگا اور ملکھاں بار بار دیکھتے ہوئے تصور میں ڈوبتی ابھرتی رہی۔ ایک عورت سے اس کی تکرار بھی ہو گئی۔ ہر عورت پیڑے دے چکنے کے بعد گوندھے ہوئے آئے کا بھاڑا ملکھاں کے حوالے کرتی تھی۔ یہ بھاڑا پانی والی دوری کے پاس رکھی ہوئی بڑی سی ایک صھک میں جمع ہو رہا تھا۔ بھاڑا روٹیوں کی تعداد کے مطابق کم یا زیادہ ہوتا تھا مگر اس عورت نے چھپیڑے دینے کے بعد ملکھاں کو جو بھاڑا دیا وہ اتنا کم تھا کہ دوسری عورت میں بھی حیران رہ گئیں۔ ملکھاں نے بھاڑا ہاتھ میں لے کر اسے ایک گیند کی طرح انگلیوں کی پوروں میں گھما یا اور بولی ”لڑکیاں اپنی گزیوں کے لیے جوروٹی پکاتی ہیں، ان کا پیڑا بھی اس بھاڑے سے تو بڑا ہی ہوتا ہے۔ دیکھ بہن!“ میرے پچوں کا باپ دن بھر جنگلوں میں بھٹک بھٹک کر جھاڑ جھکاڑ کے ڈھیر لادلاتا ہے۔ اس سے میں تھوڑتباہی ہوں۔ پھر اپنے آدھے دھر کو ہاز کی اس گرمی میں اس دوزخ میں بار بار جھوکتی ہوں۔ اس پر بھی اگر مجھے اپنی محنت کا یہ بھاڑا ملتے تو بہن اس سے تو اچھا یہ ہے کہ تو مجھے بھاڑا نہ دیا کر، میرے پچوں کے لیے دعا کر دیا کر۔“

عورت چلا ٹھیک ”تو کیا میں فقیر نی ہوں کہ تجھ سے مفت میں روٹیاں پکاؤں؟“

ملکھاں نے جواب دیا ”فقیر ہم بھی نہیں ہیں بی بی! ہم بھی اپنی محنت کی کمائی کھاتے ہیں، بھیک نہیں مانگتے۔“

عورت نے پھر کوئی جواب دیا۔ دوسری عورت میں بھی بولنے لگیں۔ ملکھاں نے بھی کوئی بات کی مگر پھر اس نے پوروں میں تھے ہوئے آئے کو بھاڑے والی صحنک میں دے مارا اور نئے پیڑے کے لیے ہاتھ یوں تیزی سکے پھیلا یا جیسے میان سے تکوار نکالی ہے۔ خاموشی چھا گئی۔ صرف ملکھاں کی آنکھیں بولتی رہیں۔ وہ کنپیوں کو چھوٹی ہوئی، لمبی، کالی سوچتی ہوئی آنکھیں، جو کسی ملک کے چہرے پوہنچیں تو سلطنت کی تقدیر بن جاتیں۔

تھوڑی سب روٹیاں اتر گئیں تو ملکھاں اٹھی۔ عورت میں چبوترے کے کنارے تک ہٹ گئیں اور ملکھاں کے شوہرن مجن کے گوشے میں پڑے ہوئے جھاڑ جھکاڑ کے ایک انبار پر ہاتھ مارا۔ ایک ڈھیر اٹھا کر تھوڑی میں جھوک دیا۔ شعلہ ایک دھماکے کے ساتھ بلند ہوا۔ لکڑیاں جیسے چکلیاں بجانے لگیں۔ چنگاریوں کا یک فوارہ آسمان کی طرف چھوٹا اور تھوڑا پھر سے تپنے لگا۔

ملکھاں جو دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی، یہاں کیا یک وہاں سے ہٹی اور اپنے چھوٹے بچے کے پاس آگئی۔ میں نے صرف آنکھیں دیکھے کے لیے اس سے پوچھا ”اس کا کیا نام رکھا ہے؟“

”بازا۔“ اس نے میری طرف دیکھ کر کہا اور اس کے ہونٹوں نے جو پیٹوں میں چھپے ہوئے تھے، اپنی مسکراہٹ اس کی آنکھوں کے حوالے کر دی۔ اللہ اکبر! یہ آنکھیں تو خدا کے وجود کا ثبوت تھیں۔

میں نے اس سے بڑے بیٹے کا نام پوچھا۔ پھر یہ پوچھا کہ کیا انہیں پر حاوہ لکھا وہ گی؟ پھر یہ کہ تمہارا دیور لا الہ پور کی کسی مل میں ملازم ہے

اور تمہارے شوہر کو کچھ بھیجا بھی ہے یا جو کہتا ہے وہ کھا جاتا ہے؟ ان سوالوں کا مجھے صرف ایک ہی جواب درکار تھا اور یہ جواب اس کی آنکھیں تھیں۔

میں نے ان چند لمحوں میں بڑی تفصیل سے اس کی آنکھوں کا مطالعہ کیا۔ میں ”بڑی تفصیل“ کی جگہ ”بھی بھر کر“ کے الفاظ بھی استعمال کر سکتا تھا مگر ایسا کر کے میں جھوٹ بھی بولتا اور ان آنکھوں کی ہٹک کا بھی مرتکب ہوتا۔ اگر ان آنکھوں کو بھی بھر کر دیکھا جا سکتا تو وہ عام آنکھیں ہوتیں، مگر وہ عام آنکھیں نہیں تھیں۔

ان آنکھوں کی پتلیاں اتنی سیاہ تھیں کہ اگر رات اتنی سیاہ ہوتی تو سورج کو طلوع ہونے کے لیے بڑی محنت کرنا پڑتی۔ سفید حصہ اتنا سفید تھا کہ ہمکا نیلا ہو رہا تھا۔ ڈوروں کا گلبہری رنگ شاید تور کی آنچ کی وجہ سے سرخی میں بدل گیا تھا۔ ان آنکھوں پر لمبی لمبی گنجان پلکوں کی چھاؤنی چھار بھتی تھی۔ پلکوں کی یہ قوسیں جیسے آنکھوں کے خزانے پر کمانیں تانے پھرہ دے رہی تھیں۔ وہ پلکوں کر بہت نرمی سے جھپکتی تھی۔ نہایت آہستہ جیسے اسے نیند آ رہی ہے گردوہ نیند کو روک رہی ہے۔

میرے سوالوں کا یو چھاڑ کا جواب دیتے ہوئے آخر میں اس نے اپنی آنکھیں جھکالائیں اور جھکائے رکھیں۔ مجھے اپنے ندیرے پن سے دو ہری کوفت ہوئی۔ ایک اس لیے کہ وہ کسی حد تک میرا مقصد پھانپ گئی تھی اور دوسرے اس لیے کہ وہ جھکلی ہوئی آنکھیں لیے تور کی طرف پلٹ گئی۔

شعلے بیٹھے گئے تھے اور تور کی دیواریں دیکھنے لگی تھیں۔ ملکھاں تور کی طرف چل دی تھی اور اس کی جگہ اس کا شوہر میرے پاس آگیا تھا۔ تور کے کنارے بیٹھ کر اس نے ما تھے کی پٹی کو بھوؤں تک کھینچا اور دامیں بازو کی پٹی کی لگتی ہوئی ایک دھمکی کو وہیں کہیں اڑس کرتور میں جھانکی اور شوہر سے بولی ”حق تازہ کر کے میاں جی کو بھی پلا۔ اتنی دیرے بیٹھے ہیں۔ کیا کہیں گے۔“

چوپال پر آ کر میں نے تور میں روٹیاں لگانے کے سلسلے میں جھیورنوں کی بے پناہ مشقت کا ذکر چھیڑا تو سب میرے پیچھے پڑ گئے۔ سب کی شکایت تھی کہ جھیور نہیں تو مفت کا بھاڑا لیتی ہیں ”او پھر جو کچھ کھاتی ہیں وہ اتنا بہت سا ہوتا ہے کہ پورا کھا بھی نہیں سکتیں۔ بڑے گھروں کی وہ عورتیں جو آنا گوندھنے کا وقت نہیں نکال سکتیں، کہلوا بھجتیں ہیں کہ اتنی روٹیاں بھجوادو۔ یہ روٹیاں اسی بھاڑے سے پکتی ہیں اور بدالے میں مینے آدھ مینے آدھ مینے بعد جھیور نہیں ہر گھر سے من آدھ آدھ من گندم سمیٹ لے جاتی ہیں۔ پھر بھی آنانق جاتا ہے اور وہ ائم ملکھوں پر آئے کی موٹی موٹی رسیوں کی سویاں بٹتی ہیں اور گز کے بھاؤ پتھری ہیں۔ آپ شہر میں رہتے ہیں۔ آپ کیا جائیں کہ یہ جھیور موبھی ”لوہار“ کہا رہیں کس کس طرح دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔

ملکھاں کے دونوں ہاتھ میرے سامنے ابھرے۔ آئئے میں نے ہوئے ہاتھ جو پیڑے کو روٹی میں بدلنے کے لیے حرکت میں آئے تو

جیسے کائنات تختیت ہونے لگی۔ ملکھاں کا دایاں بازوں کندھے تک پیوں میں لپٹا ہوا تھا اور اسی پا تھوڑے پر پچھلی ہوئی روئی تھی۔ بایاں پا تھوڑے تور کی  
منڈیر کو جذبے ہوئے تھا اور سور کی دیوار تباہ ہو رہی تھی اور یقینے تھے میں انگارے دکھ رہے تھے۔ پھر ملکھاں نے گھنٹے لیکے، جھکی اور اس کا  
آدھا وحدت تور میں غرق ہو گیا اور اس کا پیٹا میرے پنچھا جھلنے لگا اور چوپال پر سے آواز آئی کہ جیسی گرمی اب کے سال پڑی ہے ویسی پچھلی  
ایک صدی سے نہیں پڑی۔ پھر جب ملکھاں اٹھی اور پیوں میں لپٹنے ہوئے چہرے پر اس کی میمی ہوئی آنکھیں کھلیں تو جیسے وہ شعلے پی آئی  
تھیں۔ یہ آنکھیں جنمیں دیکھ کر کیا جو خفتہ دہوتا تھا سلگ رہی تھیں اور ان کا ڈوروں میں چنگاریاں بھر گئی تھیں اور ان کے پیوں پر کا جل کی  
جائے را کھکے ذرے بیٹھ گئے تھے اور ان کے سامنے گوند ہے ہوئے آٹے کے ذرا ذرا سے بھاڑے کے گولے ناق رہے تھے۔

لوگ جب گرم روزیاں کھاتے ہیں تو اگر ملکھاں کے ہاتھوں کو یاد نہیں رکھ سکتے تو اس کی ان آنکھوں کو کیسے بھول جاتے ہیں جو اگر  
ملکھاں کی بجائے ان کی ماں، بہن، بیوی یا بیٹی کے چہرے پر ہوتیں تو دنیا کے سارے تنکے اپنی آنکھوں میں بھر لیتے تاکہ ان کے پیاروں  
کی آنکھیں محفوظ رہیں۔

گاؤں میں قیام کے دوران میں ملکھاں کو میں نے اس کے بعد دوبارہ دیکھا۔ ایک بار وہ نہیں کے نخنے سے چراغ میں مٹی کا تیل ڈالو اکر  
نکلی تو ادھر سے میں گزر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولی ”رو بلا یعنی دو ر بلا یعنی۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکنے کے لمحے کو ذرا سا طول  
دینے کے لیے پوچھا ”چراغ میں تیل ڈالوایا ہے؟“ جواب میں اس نے ”جی“ کہا۔ مگر یہ کہتے ہوئے اس نے آنکھیں جھکالیں اور میں جیسے  
تھوڑے میں اتر گیا۔

دوسری بار میں ایک بھونڈ اسابہانہ بنا کر ملکھاں کے ہاں اس وقت جانکلا جب سورتیں سروں پر چلگیر دل سے ڈھکی ہوئی حصکیں رکھے  
روٹیاں پکوانے جا رہی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ اس کا شوہر گھر پر نہیں ہے۔ میں ابھی کچھ دیر پہلے اسے چوپال کی گلی میں سے جاتا ہوا دیکھا آیا  
تھا مگر میں نے آتے ہی اسی کا پوچھا۔ ملکھاں تھوڑے سامنے پیوں میں لپٹنی ہوئی بیٹھی تھی اور سور کی آنچ میں کمی کا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے  
دیکھتے ہی اس نے آنکھیں جھکالیں اور بولی ”جی وہ روپے شریف پر سے خاک پاک لانے گیا ہے، نخنے کو چٹانے کے لیے۔ کل سے اسے  
عجیب سی کھانی اٹھو رہی ہے۔“

”اوہو۔“ میں نے کہا۔ اس سے زیادہ کہنے کا مقدور ہی نہیں تھا اور اگر میں کچھ کہنے کی ہمت کر بھی لیتا تو زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتا تھا  
کہ یوں آنکھیں نہ جھکالیا کرو اس طرح آسان بالکل سر پر جھک آتا ہے۔

چند قدم چلنے کے بعد میں نے سوچا کہ کچھ کہنے کا یار نہیں تو پلٹ کر دیکھ ہی لوں۔ مگر میری یہ حرکت میرے بھانے سے بھی زیادہ  
بھونڈی ہوتی۔ سوچلا آیا۔ مگر اب یہ مشکل آپڑی کہ میں جب بھی ملکھاں کی آنکھوں کو تصور میں لاتا، انہیں جھکا ہوا ہی پاتا۔ میں اپنے آپ

سے لڑتا رہا کہ آخر ایسا بھیکیا۔ آخر میں نے اس کی کھلی آنکھوں کو بھی دیر تک اور اتنے قریب سے دیکھا ہے اور ان وہ کچھ پایا ہے جو پوری زندگی میں نہیں پایا۔ پھر جب میں ان کے بارے میں سوچتا ہوں تو وہ مند کیوں جاتی ہیں۔ میں نے طے کیا کہ کل شام اس کے ہاں جا کر بے حیاؤں کی طرح بیٹھ جاؤں گا اور اس سے ادھراً دھر کی بہت سی باتیں کروں گا اور جب وہ اپنی آنکھوں کی پوری لمبای اور گہرائی سے مجھے ایک بار دیکھے گی اور جب وہ اپنی آنکھوں کی پوری لمبای اور گہرائی سے مجھے ایک بار دیکھے گی تو میں فوراً وہاں سے اٹھاؤں گا تاکہ ان بھر پور آنکھوں کے تصور سے میرا ذہن ہمیشہ جا گتا رہے۔

دوسرے دن شام سے پہلے مجھے ایک معقول بہانہ بھی سوچ گیا۔ آخر اس کا بچہ بھی تو یہاں رہتا اور جب میں پہچے کی مزاج پری کروں گا تو اس کی آنکھیں یقیناً جھکنا بھول جائیں گی۔

میں گھر سے نکلا۔ ابھی ملکھاں کے گھر سے کوئی سوگز کے فاصلے پر ہی تھا کہ یہاں ایک بہت سی عورتوں کی چینیں ایک طوفان کی طرح المڈیں۔ پھر آس پاس کی گلیوں میں سے لوگ بھاگتے ہوئے آئے اور ملکھاں کے گھر میں گھس گئے۔ پھر مردوں کی اوپنجی اوپنجی آوازیں آنے لگیں اور عورتوں کی چینیں بلند ہوتی جلی گئیں۔

میں بھاگا اور ملکھاں کے گھر میں داخل ہو گیا۔

ملکھاں کے سرچہرے سینے اور بازوں پہنچی ہوئی پہنچوں کو نوچ کر چینک دیا گیا تھا اور ان میں سے وہواں نکل رہا تھا اور عورتیں ایک فووارہ عورت کو بتا رہی تھیں: ”نوراں سے بھاڑائے کراس نے صحیح میں رکھا۔ پھر ایک پیڑے کی روٹی بنایا کرتھوڑ میں جھکی تو تور کی منڈر رٹوٹ گئی اور وہ سر کے بل تور کی تہ میں جا گری۔ مگر ادھر اس کا گھر والا بھل کی طرح ایا اور ہاتھ بڑھا کر اسے نکال لیا۔ قدرت خدا کی جو حصہ انگاروں پر گراں پر پٹیاں بندھی تھیں اس لیے نجگئی۔ بس یہ ہوا کہ بے چاری کی آنکھیں بھن گئی ہیں۔“



# بندگی بے چارگی

کتنی عجیب بھی کہ امین تو ڈیوڈ اینڈ ڈیوڈ لمینڈ میں اکاؤنٹنگ تھا اور کوٹ پتلون پہنچتا تھا اور جب اردو بھی بولتا تھا تو آدمی انگریزی بولتا تھا مگر اس کو منگر اب تک کھیتوں پر سے چڑیاں اڑاتی اور ماہیا گاتی تھی۔ امین شہری بودوباش کا اتنا عادی ہو چکا تھا کہ چھٹی پر گاؤں آتا تو بہت سی ڈبل روٹیاں ساتھ لاتا تاکہ ناشتے میں توں مکھن سے محروم نہ رہے اور جب اس کی ماں توے پر توں سینکھی تو وہ سوچتا کہ اس وقت پا بانو دہی بلور ہی گی اور جب وہ چائے کی پیالی میں چینی ملارہا ہو گا تو وہ لسی کے کٹورے میں نمک ملارہی ہو گی اور اس کی مہین مہین گندھی ہوئی مینڈھوں کے نیچے چپھی ہوئی اس کے کافنوں کی بالیاں آپس میں نج رہی ہوں گی۔ اور اس کی لمبی گھنی پلکوں کے سائے اس کے گاؤں پر دوڑ گئے ہوں گے اور اس کی گردن کی مکھن ایسی سفیدی نے اس کی رگوں کو اور زیادہ نیلا کر دیا ہو گا اور

کتنی عجیب بات بھی کہ امین نے جب بھی اپنے اور بانو کے درمیان معاشرتی تقاوٹ کے بارے میں سوچا، اس کا ذہن آخر کار بانو کی گردن اور گریبان تک پہنچ گیا اسی لیے تو وہ اپنے بخیث شہری تمدن کے باوجود ایک الحزادیہاتی لڑکی کے ساتھ اپنی ملکتی قائم رکھے ہوئے تھا۔ شہر کے جس محلے میں وہ رہتا تھا اور جس دفتر میں کام کرتا تھا وہاں اسے ایک سے ایک سے ایک اچھا رشتہ پیش کیا گیا، مگر اس اچھائی کا محور ان لڑکوں کا حسن نہیں تھا۔ جیز تھا یا ان کے والدین کی دولت تھی۔ جمالیات میں نہ کئی معاشریات میں تو دولت بھی بہت بڑا حسن میں کی سوندھی سوندھی خوبصورت ہوا بس جاتی تھی تو اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ باہر جا کر بھیل دھرتی کے گلے میں پانیں ڈال دے۔ اسے گلاب کا پھول اس لیے بھالا لگتا تھا کہ وہ پھول ہے۔ اس لیے نہیں کہ اس سے گنگلوں بن سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے سونے چاندی کی طرف دیکھنے سے پہلے لڑکوں کو دیکھا۔ اور جب بھی دیکھا، دہی بلوتی ہوئی بانو ذرا سی مسکرا دی اور وہ شیشے کی بجائے موسم کی باتیں کرنے لگا۔

جب گاؤں میں خبر پہنچی کہ امین ساڑے تین سو ماہی پر ایک ولایتی فرم میں اکاؤنٹنگ ہو گیا ہے تو بانو کے والدین نے صرف اتنا کیا کہ اسے پانی بھرنے کے لیے کنوں پر جانے سے روک دیا اور بانو اس پابندی پر یوں رو دی جیسے اس مایوں بخدا دیا گیا ہو۔ اس روز، گھر سے کنوں تک کی وہ کون سی چیز تھی جو اسے یاد نہ آئی تھی۔ اسے تو وہ چیزیں بھی یاد آگئیں جن کی طرف غور سے دیکھنے کا اسے کبھی خیال نہ آیا تھا۔ لوہاروں کے گھر کے پاس آک کی جھاڑی پر سونی پھول، میرداد کا کتا جادن بھر دلیز پر بیٹھا آتی جاتی لڑکوں کو غنڈوں کی طرح گھوڑتارہتا تھا۔ گلی میں جھکی ہوئی شیرخان کے صحن کے سینے پر بھیل ہوئی امر نیل، جس کے پیلے دھاگوں کو نیچے ذرا سا کھینچتے تھے تو بیری کی پھنگ تک ہل جاتی تھی۔ قبے سے آتے ہوئے ہر کارے کی مونچیں جن میں ایک بھیش کھڑی ہوئی اور دوسری بھیش کھڑی ہوئی تھی۔ کنوں پر نور اس

۔

ناں کے گندے لفیفے جنمیں سن کر لڑکیاں کانوں کی لوئیں چھو کر توبہ توبہ کرتی تھیں اور پھر سب خوب نہتی تھیں۔ بانو سے جیسے ایک دم سارا گاؤں چھن گیا تھا اور جب باپ چلا گیا اور اس نے ماں سے فریاد کی کہ ”ماں! مجھے جو چاہو بنا دو پر بی بی جی نہ بتاؤ۔“ تو اس کی ماں مسکرا دی تھی۔ بالکل اس ساس کی طرح جس کی بہود روؤں سے بے چین ہو کر پکارتی ہے ”ماں اللہ مجھے بچو چہ نہیں چاہیے۔“ اور ساس مسکراتی ہے۔

شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں جب امین گاؤں آیا اور اس کی ماں نے اسے خوش ہو کر بتایا کہ بانو اب کنوئیں پر پانی بھرنے نہیں جاتی تو امین کو بہت برالگا ”کیوں؟“ کیوں نہیں جاتی؟ میں بانو سے اس لیے تو شادی نہیں کر رہا ہوں کہ اس کا باپ میرے ابا دوست ہے۔ یا انہیں اگلی فصل تک گندم خریدنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ میں تو اس لیے شادی کر رہا ہوں کہ وہ ایک سادہ دیہاتی لڑکی ہے اور وہ۔

وہ ماں کو یہ کیسے بتایا کہ ”وہ سر پر دو بھرے ہوئے گھڑے رکھ کر جب چلتی ہے تو اس کے جسم کے تمام خطوط جاگ اٹھتے ہیں۔ وہ دو پھر کو اپنے باپ کے لیے کھانا کے جاتی ہے اور آس پاس کوئی نظر نہ آئے تو ہولے ہولے ماہیا گنگنا نے لگتی ہے اور جب اس کا باپ کھانا کھارہ ہوتا ہے تو وہ گوپھیا گھما کر غلام پھیلتے ہوئے ”ہاہا، ہاہا، ہوووووووو“ کی آوازیں لگاتی ہے اور یوں باجرے کی فصل پر سے چڑیاں اڑاتی ہے۔ گھاس کے بڑے بڑے گھٹے اٹھاتی ہے، گائیوں کے آگے چارہ ڈالتی ہے اور جب گائیں موقع پا کر اس کی پیٹھ کو چلتی ہیں تو وہ انہیں یوں جھڑکتی ہے جیسے پیاری سہیلیوں کو جھڑکا جاتا ہے۔ دہی بلوتی ہے، آستین کو کندھے تک چڑھا کر کھن نکالتی ہے۔ بیزی بیچنے والی عورتوں کے ساتھ ایک ایک گا جر باتھ ہلاپلا کر جھڑکتی ہے اور سہیلیوں کی شادی پر ایسی لذتی ناچتی ہے کہ میرا نہیں کان پکڑتی ہیں۔ اس وقت وہ کتنی پیاری، کتنی اچھوٹی لگتی ہے، مگر وہ یہ سب کچھ کیسے کہتا۔

”اور۔۔۔۔۔“ امین صرف اتنا ہی کہہ پایا تھا۔ ”اور مجھے یہ کچھ اچھا نہیں لگا۔“

”کیوں اچھا نہیں لگا؟“ اس کی ماں نے پوچھا تھا۔ تمہیں میرے ہاتھ کا پراٹھا اچھا نہیں لگتا اس لیے شہر سے اپنے لیے یہ موئی پھولی ہوئی روٹیاں اٹھاتے ہوئے تمہیں بانو کا گاؤں گاؤں میں کھلے بندوں پھرنا اچھا لگتا ہے۔ کیوں؟ پر تم تو بچپن میں بھی ایسے ہی تھے۔ گھر میں دال پکتی تھی تو رور کر آفت کر دیتے تھے اور پھر پیاز اٹھا کر کھا لیتے تھے۔“ اس کی ماں ہنسنے لگی تھی اور امین سوچتا رہ گیا تھا کہ بہت اچھا۔ ایک بار شادی ہو جائے اور میں لا ہور چلا جاؤں، پھر دیکھوں گا کہ بانو پر کون قد علمیں لگاتا ہے۔

شادی کے دو روز بعد جب بانو کا بھائی اسے میکے لے جانے کے لیے آیا اور بانو ریشمی چادر کا ذرا سا گھونگھٹ نکال کر اپنے بھائی، سہیلیوں اور میرا سنوں کے ساتھ زیور چھپھٹھاتی اور سلماستارہ چکاتی چلی گئی تو امین کا جی چاہا کہ وہ بھاگ کر جائے اور بانو کے گھونگھٹ کو اتنا

کھینچ دے کہ اس میں سے بانو کی جگلی ہوئی لمبی آنکھیں، اُنھی ہوئی پتلی ناک، تیز کنارے والا ترشا ہوا بالائی ہونٹ اور گالوں کے تروتازہ گلاب کی چند پتیاں بھی دکھائی نہ دے سکیں۔ وہ بے قرار ہو کر اٹھا۔ نپولین کی طرح چیچپے ہاتھ باندھ کر اور سر کو ذرا سا جھکا کروہ دیر تک ٹھہلا رہا۔ جیسے غیرت و حیثیت کے والڑ لوپر اس کے ضمیر کا لٹکر پس پا ہو رہا ہے۔

وہ باہر گلی میں آگیا تو اسے ہوا مہندی کی نش آور خوبصورتی ہوئی محسوس ہوئی۔ پھر اسے ایس لگا جیسے گلی میں سے گزرتے ہوئے لوگ نتنہ پھلا کر لمبی لمبی سانسیں لے رہے ہیں اور اس خوبصورتی کی وجہ سے لڑکھڑا کی ہوتی ہے اور تکوں نے لٹائی تھی۔ پھر اسے گمان سا ہوا کر گلی کے موڑ پر جو چند چنگاریاں سی چمک رہی ہیں، یہ بانو ہی کے لباس کا سلماستارہ ہے۔ اچانک ایک نوجوان جو گلی میں مز گیا تھا، پلت کر آیا اور سلماستارہ اٹھا کر چلا گیا۔ اور امین کا جی چاہا کہ اس کا پیچھا کرنے اسے دبوچ لے اور اس کی کلامی مروڑ کر اس کی مٹھی میں سے سلماستارہ نوچ لے۔

بانو کے لیے کھڑا کھڑا تھے کاسغید برقع بن کر آیا تو وہ دن بھر سبھی بیٹھی رہی۔ اس کی ساس جب برقع کی آنکھوں کی مہین جالی اور نوپی کی باریک چننوں کی تعریفیں کرتی تو بانوں کو یوں محسوس ہوتا جیسے قصائی بکرے کو سامنے بخا کر چھری کی دھار کی تعریف کر رہا ہے۔ خوب چیز چیز کر رہے ہیں کا اس کا کیسا کیسا کجی چاہتا رہا اور آخر جب رات کو اسے تھائی ملی تو وہ یوں دل کھول کر روئی جیسے اسے اپنی بچھڑی ہوئی مال گئی ہے۔ پھر جب امین آیا اور اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر چومنا چاہا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ تو رورہی ہے اور اتنا رورہی ہے کہ اس کا گریبان بجیگ رہا ہے۔ اور جب اسے معلوم ہوا کہ وہ کیوں رورہی ہے تو اس کے ذہن میں سب سے پہلے یہ خیال آیا کہ غالب کی غزل کو اگر غلط پڑھا جائے تو یقیناً روتی ہو گی۔ مگر یہ خیال ایک کونڈے کی طرح لپکا اور کونڈے پل بھرہی کو لپکتے ہیں اور پھر اندر ہیرا اچھا جاتا ہے۔

بچوں کی طرح سکتی ہوئی بانو کے سر کو اپنے بائیں بازو میں تھام کر اور دایکس ہاتھ سے اس کے گالوں پر سے آنسو پوچھتے ہوئے امین نے اسے بتایا کہ زمانہ بدل رہا ہے ”پہلے ہم خپروں اور اونٹوں پر سفر کرتے تھے اب ہمارے گاؤں میں سے سڑک گزرتی ہے اور اس پر بسیں چلتی ہیں، تو کیا یہ رونے کی بات ہے؟ میرے باپ دادا نے اسی گاؤں کے کھیتوں میں مل چلا یا ہے گمراہ وہ یہ کام مزاروں سے لیتے ہیں۔ کیا وہ اس باپ پر رونے ہیں؟ ہمارے گاؤں کے پردہ دار کھرانوں کی حوالیوں میں آج جو یہاں چھپی بیٹھی ہیں ان کی وادیوں اور نائیوں نے بھی تمہاری طرح گھاس کائی ہے اور چڑیا اڑائی ہیں، تو کیا جب ان کے پاس دولت آئی تھی اور وہ پردے میں بیٹھ گئی تھیں؟ تو کیا وہ روئی تھیں؟ یہاں گاؤں میں تم برقع اس لیے نہیں پہنچتی تھیں کہ برقع پہن کرنے کو نیں پر سے بھرا جاسکتا ہے نہ کھیت کھلیاں کا کام ہو سکتا ہے مگر شہر میں تو تمہیں یہ کام کرنے ہوں گے۔ اور وہاں مکان کے آس پاس جتنے بھی مکان ہیں ان میں عورتوں پر دہ کرتی ہیں۔ رہایہ سفید برقع

تو وہاں لا ہو رہیں ہم اس سے بخیے اور میر پوش بنا لیں گے اور تمہیں کالے ریشم کا برقع سلا دوں گا، چاہے اس پر میری آدمی تجوہ اٹھ جائے۔“  
جس روز امین اپنی بیوی کو ساتھ لے کر لا ہو رہے ہے کے لیے بسوں کے اڈے کی طرف چلا تو وہ اپنے آپ سے لڑ رہا تھا۔ اگر سفید  
برقعے کی تجوہیں جانی بانو کی بھی کافی آنکھوں کے خطوط کو چھپانے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکی تھی تو آخر کیا ہوا۔ بھی بانو جو برقعے میں  
بے ڈھنگے طریقے سے اکھڑی اکھڑی چل رہی ہے، انھی را ہوں پر ہرنی کی طرح قلائقیں بھرتی رہی ہے۔ پھر اگر اس کی آنکھوں کی قوسیں  
برقعے کی جانی سے جھلک رہی ہیں تو ایسا بھی کیا۔ مگر یہ محسوس کر کے اس کے دل میں عجیب دھن سی ہوئی کہ اڈے کا ہر آدمی جیسے بانو کے  
برقعے کی جانی کو گھورے جا رہا ہے۔ اس زمانے کے لوگ تو ایسے گھاگ ہیں کہ عورت کی چنگیاں دیکھ کر اس کے پورے ناک نقشے کا اندازہ لگا  
لیتے ہیں اور یہاں تو آنکھیں اپنے پورے طول و عرض کے ساتھ نمایاں تھیں۔

راتستہ بھروسہ بس میں مسافروں کی طرف دیکھتا رہا کہ کہیں وہ بانو کی طرف تو نہیں دیکھ رہے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر اس کا سارا خون  
اس کے سر میں جمع ہو کر اعلیٰ لگتا تھا۔ ایک بار بانو نے اپنا مہندی لگا ہاتھ برقعے میں سے نکال کر اگلی سیٹ کی پشت پر رکھا تو امین کا چہرہ لال  
ہو گیا جیسے سب مسافر اس کی بیوی کے ہاتھ کی باتیں کر رہی ہیں۔ اس نے بانو سے ہاتھ چھپا لینے کو کہا تو بانو نے جیسے ایک جھکلے کے ساتھ  
اسے پلٹ کر دیکھا اور ہاتھ کو یوں تیزی سے برقعے میں لے گئی جیسے اگر وہ اسے اپنے پنچے سے الگ کر سکتی تو چلتی بس میں سے باہر پھینک  
دیتی۔

لا ہو رکھنے کر امین کے چھوٹے سے مکان کی چار دیواری میں بانو چند روز تک پھر کی اور پھر مخدوشی ہو گئی اور ادھر امین نے اپنے قریبی  
دوستوں کو بتایا کہ زندگی میں اصل چیز تجربہ ہے۔ تجربہ نہ ہو تو انسان اور گدھے میں صرف یہ فرق باقی رہ جاتا ہے کہ انسان کی دوڑ اور گدھے  
کی چار نانکھیں ہوتی ہیں۔ تجربہ ہی انسان کو انسان اور پھر متمدن انسان اور مہربان انسان بناتا ہے۔ ایک مولوگوں کو کیا پڑ کے مخدوشی چھاؤں کتنی  
بڑی نعمت ہے۔ میں حسن کو ایک ایسی دولت کی اصل جگہ گھر کر بیٹک ہے۔“ آزاد خیال اور شاعر مزاج امین کی ان باتوں پر سب دوست نے  
مگر یہ تفہیک کی بھی نہیں تھی۔ ان فکر کوں ہمیذ فکر کوں اور آفس پر نہنڈ نہوں نے ایک ذہن نوجوان کو آزاد روی کو لعنت کا شکار ہونے سے بچا لیا  
تھا۔

جب بانو کا سیاہ ریشمی برقع سل کر آیا تو بانو پر بھی یک ایک اکشاف ہوا کہ وہ ترقی کر گئی ہے۔ اس اکشاف نے یقین کی صورت اس وقت  
حاصل کی جب چند مینے کے بعد وہ ایک عزیز کی شادی پر گاؤں گئی۔ بس کے اڈے پر جب وہ اپنے ریشمی برقعے میں طوفانی سمندر کی سی  
لہریں پیدا کرتی ہوئی اتری اور جب اس کے بعد نائی سوٹ میں ملبوس اس کا شوہر اترا اور بس کی چھت پر سے ان کے چڑے کی اچھیاں  
اتریں تو سب لوگ یوں دم بخود کھڑے دیکھتے رہے جیسے بس کے اڈے پر ہوائی جہاز اتر رہا ہے۔ پھر جب شادی والے گھر میں وہ لڑکیاں

اس سے ملنے سے زیادہ اسے دیکھنے آئیں جن کے ساتھ اس نے مائیے گائے تھے اور لذیاں ناچی تھیں اور جچے کاتے تھے تو اسے یقین ہو گیا کہ وہ ان سب سے الگ اور اوپری خلوق ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں کے ناخن چمکتے ہوئے لال رنگ کی پاش سے دیکھتے ہوئے انگارے ہو رہے تھے۔ اس کے ہونٹ تازہ زخم کی طرح بھیگے بھیگے اور گہرے سرخ تھے۔ کابل کی لکیر اس کی لمبی آنکھوں کو کنپیوں تک کھینچ لے گئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں نخا سار و مال تھا اور وہ رنگین ریشمی لباس میں یوں کسی ہوئی تھی کہ اس کی ناف کا دائرة تک نظر آ رہا تھا۔ دوسری عورتیں گاتی ہوئی میرا سنوں کو پیسہ پیسہ دیتی تھیں مگر بانو گردان کے نیچے جپر کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر چونیاں انھیاں نکال لاتی تھی۔ اور جب ماضی کی ہجولیوں نے اس سے لا ہور کا پوچھا تو وہ اتنے بڑے اور بہت سے جھوٹ بولتی کہ ساری عمر نہیں بولی تھی۔ پھر جب وہ برقع اوڑھ کر بھی اور دو ہری نقاب کو سر پر لٹ کر اس نے سنہری سیندل پہنی اور سکرا کر رخصت ہوئی تو عورتیں دیر تک اس بھینی بھینی خوشبو کو سوچتی رہیں جو باتوں کا سر سرا اتا ہوا برقع بکھیر گیا تھا۔

اب بانو کا برقع، نیل پاش اور اپ اسک کی طرح اس کے سامان آرائش کا ایک حصہ بن چکا تھا۔ جب بھی وہ ہر مہینے کی کیم کی شام پڑو سنوں کی نوی میں شامل ہو کر شاپنگ کو جاتی تو واپس آ کر دیر تک برفع کو استری کرتی رہتی۔ امین دگنی تھنگوا پر ایک اور فرم میں چلا گیا تھا اس لیے ایک کوٹھی کی ایکسی کرائے پر لے لی تھی۔ اس نے بانو کو ایک نوکرانی بھی رکھ دی تھی۔ خود ایک سکوڑ بھی خرید لیا تھا اور ڈرینگ گاؤں کو بھی پہننے لگا تھا۔ اس کی بیٹھک میں صوفہ سیٹ اور شیشے کی تپائیاں بھی آگئی تھیں۔ ہفتے عشرے میں ایک آدھ باروہ اپنے دفتری دوستوں کو دعوت پر بھی بلانے لگا تھا۔ اب اس کے دوستوں کا طبقہ بھی بدلتا گیا تھا۔ ان دوستوں میں کئی ایسے بھی تھے جن کی بیویاں پر دہنیں کرتی تھیں کبھی کبھی وہ بھی عورتوں میں شریک ہوتی تھیں۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے اندر جا کر بانو کی مزاج پر ہی کر لیتی تھیں۔ مگر ان کا زیادہ وقت مردوں کے درمیان ہی گزرتا تھا۔ وہ عالمی سیاست سے لے کر عورتوں کے پردے، گوبھی کے بھاؤ اور مرچوں میں ملاوٹ تک کے موضوعات پر باتیں کرتی تھیں۔

بعض دعتوں میں فرموں کے بڑے بڑے اہلکار بھی موجود ہوتے تھے اور ان کی بیگموں کے ساتھ چھوٹے اہلکاروں کی بیویاں یوں گھل مل جاتی تھیں جیسے ساتھ کھیلی سہیلیاں ہیں۔ پھر امین کو یہاں کیک معلوم ہوتا تھا کہ فلاں کو ایک دم ترقی مل گئی ہے اور وجہ یہ ہے کہ اس کی بیوی اور ”باس“ کی بیگم کے درمیان بہنا پے کارشنہ پیدا ہو گیا ہے اور عید الفطر کے موقع پر آپس میں سو یوں کا تبادلہ تک ہوا تھا۔

”غلط بات ہے۔“ امین کہتا تھا۔ ”یہ بالکل ہی بغیرتی ہے، جیسے میں اپنے باس کو دعوت پر بلاوں اور اپنی بیوی سے کہوں کہ صاحب کے منہ میں نوالے ڈالو۔“ نہیں حضور ایہ ہم سے نہیں ہو گا۔ ہم دیہاتی لوگ اگر ایسی باتیں سوچیں تو دماغ کی وجہیاں اڑ جائیں۔ تو بہے بھی۔ حد ہو گئی بے حیائی کی۔“

کتنے ہی الہکار اپنی بیویوں کو اپنی ترقی کی سیڑھیاں بنانے کی طرف لپکے جا رہے تھے اور امین مہینوں کی منزلیں برسوں میں طے کر رہا تھا۔ چند جو نیمر لوگ جو فرم کے ساتھ اس سے کہیں بعد منسلک ہوئے تھے، اب اس کے افسروں میں شامل تھے۔ اس کے باوجود وہ صابر اور قانع نظر آتا تھا۔ ہر سال دفتری قواعد کے مطابق اس کی تنخواہ بڑھ جاتی تھی اور اسی لیے چند سال کے بعد وہ بھی ایک ایسے عہدے پر پہنچ گیا کہ انگلی کچوڑ کر چھوٹے سی بیکھلے میں آگیا۔ سکوڑ پیچ کرنے کی کار خریدی اور ایک دن میں دوبار شیو بنانے لگا۔

اس دوران میں بانو کے ہاں تین بچے پیدا ہوئے۔ بڑا بچہ ایک کانوٹ سکول میں داخل ہو کر ”گذ مارنگ“ اور ”ناما“ بولنے لگا تھا اور بانو اپنے بچوں کو ایسی کہانیاں سنانے لگی تھی جن میں پریاں کیک کھاتی ہیں۔ ہائیڈ پارک کے پھولوں میں محل بناتی ہیں۔ شہزادوں پر فدا ہو کر ان کا پیچھا کرتی ہیں تو انہوں سے اڑ کر پھر اس برلن یا زیادہ سے زیادہ استنبول تک جاتی ہیں اور ”ڈوڈل ڈوڈل“ قسم کے گیت گاتی ہیں۔ دراصل شادی کے فوراً بعد امین نے بانو کو تعلیم دینا شروع کر دی تھی اور اس تعلیم کی بسم اللہ ”اے بی سی“ سے ہوئی تھی اور اب جب کہ وہ بیکھلے میں رہتے تھے اور کار میں واک کو نکلتے تھے اور بیڈن پیٹتے تھے اور حیران یا خوش ہوتے تھے تو ”گذ گذ“ کہتے تھے بانو پریوں کی کہانیوں کی کتابیں خوب روائی سے پڑھتی تھیں اور ملنے والیوں کو نہیں بتاتی تھیں کہ وہ ایک ”فارمر“ کی بیٹی ہے، بلکہ کہتی تھی ”ڈیڈی ہمیشہ آترن ہاوارکی طرح اپنے فارم پر ہی رہنا لائیک کرتے ہیں۔“

اس کے باوجود پرده اس کے ایمان کا ایک جزو بن کر رہ گیا تھا۔ جب ڈرائیک روم میں قہقہے اس انتبا کو جا پہنچے تھے جب ہنسنے اور رونے میں کوئی فرق نہیں تو جب بھی وہ بچوں اور نوکروں توکرا جیوں سے یوں آہستہ آہستہ بلوتی تھی جیسے ساری دنیا نے اس کی آواز پر کان لگا رکھے ہیں۔ دعوت کے موقع پر امین کبھی ڈرائیک روم سے گلری میں آ کر پکارتا تھا ”بانیا ڈارنگ! میرے شیلف پر سگریٹ رکھے ہیں وہ بھجوادو پلیز“ تو بعد میں بانو سے سخت ست کہتی تھی کہ پرده دار بیویوں کو یوں نام لے کر نہیں پکارتے اور امین قہقہہ مار کر کہتا تھا ”وہ تو میں جانتا ہوں مگر تمہارا نام لے کر اس لیے پکارتا ہوں کہ میرے دوست یہ نہ سمجھیں کہ میں بے چارہ رہنا ہو۔“

امین جب فرم کے دفتر کے سامنے اپنی کار روکتا تھا تو دوسرے اعلیٰ افسروں کی کاروں کے مقابلے میں اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ڈیبا میں سے لکا ہے۔ پھر جب اپنے کمرے سے انٹھ کر کسی ایسے الہکار کے سامنے فالکلیں پیش کرنے جاتا تھا جو کسی زمانے میں اس کے سامنے فالکلیں پیش کرنے آیا کرتا تھا تو اس کی زبان کی جڑ میں کوئی کی گولی سی محل جاتی تھی۔ پھر بھی چوڑی میزوں کے موٹے شیشے والی سٹھ پر جب مقابل کا عکس یوں پڑتا تھا جیسے وہ دستخط کرنے کی بجائے جھیل میں جھانک رہا ہے تو کھوٹا ہوا خون اس کی کنپیوں میں چکلیاں لینے لگتا تھا۔ دفتر کا وقت ختم ہوتا تو پوری کوشش کرتا کہ سب سے آخر میں نکلے کیونکہ ایک بار جب اس سے اپنی کار شارٹ نہیں ہو رہی تھی تو ایک دوست نے یہ کہہ کر چپر اسیوں تک کے ہونٹوں پر مسکراہیں پیدا کر دی تھیں کہ ”امین! آؤ میری کار میں بیٹھ جاؤ اور اپنی کار کو میری کار کی ڈگی میں رکھ

امین احساس مکتری کو چھپانے کے لیے زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا تھا کہ اپنے اعلیٰ افسروں کی دعوییں کرے اور انہیں قسم قسم کھانے کھلانے اور ان کے کھوکھلے الطفیلوں پر چیخ چیخ کرنے۔ وہ شراب نہیں پیتا تھا مگر بھی کبھی کسی افسر سے اشارہ پا کر وہ شراب کا انتظام کر دیتا تھا۔ اس نے سرور میں آئے ہوئے افسروں سے اس قسم کی باتیں بھی سنی تھیں کہ ”امین! بھی بجا بھی سے ہمیں انڑوڑ دیوں کراؤنا۔ کب کراؤ گے؟ جلدی سے کرا دو ورنہ کسی روز ہم خود اندر جا کر کرائیں گے۔“ ایک دوبار تو اس نے نشے میں وہت اپنے باس کو گلری میں کھڑے ہو کر ”بجا بھی او بجا بھی ڈیئر“ پکارنے سے بھی روکا اور جب باس نے کہا ”کیوں؟ تم ہماری مسٹر کو دیکھو“ ہم تمہاری مسٹر کو نہ دیکھیں!“ تو کچھ تھی بھی پیدا ہو گئی تھی مگر دوسرے ہی روز اس نے دفتر جا کر پہلا کام یہ کیا تھا کہ باس سے معافی مانگ لی تھی۔

انہی دنوں فرم کے ایک جو بیرون افسر کی شادی ہوئی اور اس نے دعوتوں کا تاثبا نہ دیا۔ اس کی بیوی چکنے جسم کی نوجوان لڑکی تھی۔ ایف اے پاس تھی اور انگریزی فقرہ بار بار ”یوسی“ کہے بغیر بول لیتی تھی۔ چند ہی مہینے میں یہ اہمکار ترقی کر کے امین کے سر پر آدمکا۔ ”سرزسر“ کی رٹ لگائے رکھنے والے نے جس روز اسے ”مسٹر امین“ کے الفاظ سے مخاطب کیا تو ایک لمحے کے لیے امین بست سابن کر رہا گیا۔ پھر اس حرکت پیدا ہوئی اور وہ بولا: سر! آپ کی ترقی کی خوشی میں کل شام میں نے ایک چھوٹی سی ڈرٹک پارٹی کا انتظام کیا ہے۔ کیا آپ اور بیگم صاحبہ تشریف لاسکیں گے؟“

دوسرے روز شام کو جب مہمان جمع ہوئے اور تپائیوں پر گلاس رکھنے گئے اور امین نے داسٹ ہارس کی تو مددی بول کھول کر حسب معمول ساقی گری شروع کی تو خاص مہمان نے پوچھا ”یہ پیگ کس کے لیے ہے؟“

”میرے لیے۔“ امین نے جواب دیا۔

سب لوگ سانسیں روک کر رہے گئے۔ صرف خواتین ذرا سماں تھیں۔

خوش ہو کر سب چیخنے۔ ”نہیں!“

”کیوں نہیں؟“ امین نے گلاس کو پیشہ و شراب نوشوں کی طرح سرتک بلند لے جا کر کہا ”ہرآ“ سب چلا اٹھے۔

اور تین کمرے ادھرنو کر انیوں کو ہدایت دیتی ہوئی بانو چوکی کچھ دیر تک بھویں سمیت کر گلری میں کھلنے والے دروازے کی طرف دیکھتی رہی اور پھر یک لوز کروں پر خفاہونے لگی۔

کچھ و قفقے کے بعد بانو کو ایسا لگا جیسے وہ کوئی کی بجائے چھلی منڈی میں بیٹھی ہے۔ ڈرائیکٹ روم میں سے البتا ہوا شورا تنہ مسلسل اور اتنا بلند تھا جیسے یہ سارا ہنگامہ گلری میں ہو رہا ہے۔ اتنے لمبے قیقہے کہ آخر میں کراہیں بن جاتے تھے۔ اتنے اوپر نظرے جے چینیں بلند ہو رہی

ہوں۔ اور عورتوں کی ہنسی میں تو چھری کی دھار تھی۔ اس نے گھبرا کر پھوں کے کمرے کی طرف دیکھا مگر دروازہ بند تھا۔ اسے سامنے گھرے ہوئے بیرے سے شرمی آنے لگی۔

”صاحب کو بلاو۔“ اس نے بیرے سے کہا۔

بیڑا گیا، واپس آیا اور چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔

”صاحب کو بلاو یا؟“ بانو نے بیرے کا فق چھرہ دیکھ کر پوچھا۔

”جی صاحب تو.....“ وہ پلکیں جھکتے اور ہاتھ مرزوں نے لگا۔

ایک لمحے کے بعد خود بانو کا چھرہ بھی فق ہو گیا۔ اس نے گلری میں کھلتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا اور خوفزدہ ہو کر انے قدموں پیچھے بٹنے لگی۔

امین کی رہنمائی میں اس کی دوستوں اور ان کی بیگموں کا ریلا اندر آگیا۔ بیگموں کی ریشمی ساریوں کے پلوان کے شانوں سے گزر کر نیچے گھٹ رہے تھے اور ان کے بلاوزوں کے زیریں حاشے بہت اوپر اٹھ گئے تھے۔ وہ مسلسل ہنس رہی تھیں۔ آتے ہی وہ پھوں کے کمرے اور ہاتھ روم کے دروازوں پر چوکیداروں کی طرح جا گھٹری ہو گیں اور بانو جس کے لیے بھاگنے کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے دیوار سے چھٹ کر رہ گئی تھی اور اس نے دوپٹے سے اپنا چھرہ چھپا لیا تھا۔

سب اپنے جسم کا توازن قائم رکھنے کی کوشش میں جھوم رہے تھے اور یوں پاؤں پھیلائے کھڑے تھے جیسے ان کی ہانگوں کے درمیان سے نالی گزر رہی ہے۔ امین کا توبیہ عالم تھا جیسے جمناسنک کھیل رہا ہے۔

انتہائی نش میں امین کی زبان تالو سے لگنا اور دانتوں کو چھونا بھول گئی تھی اور وہیں اپنی جڑ کے پاس گھوم پھر کر رہ جاتی تھی۔ اسی لیے الفاظ اس کے منہ میں سے گیندیں سی بن کر گولائی میں نکل رہے تھے۔ اس نے بانو کی طرف پورا بازا و اٹھایا اور بولا: یہ ہماری بیگم ہیں۔ یہ مسرز امین ہیں۔ مسرز بانیا امین۔ جیلو بانیا ڈارنگ! میٹ مائی ڈیسرو ٹیسرو ٹیسرو فرینڈز اینڈ دیسرو بیوٹی فل وا یوز۔ کم آن اوکم آن۔“

مہماں قبیچہ مارنے لگے ان کی بیویوں کو ہنسی کا ہشریا ہو گیا اور امین کر سیوں اور الماریوں کا سہارا لیتا تپائیوں پر سے گلدان اور تصوریں گراٹا بانو کے پاس پہنچ گیا۔ پھر اس نے مہمانوں کی طرف یوں دیکھا جیسے مداری ٹوپی میں سے کبوتر نکالنے سے پہلے تاشائیوں کو دیکھتا ہے۔ اس کی چڑھی ہوئی پتلیاں اور اوپر چڑھ گئیں۔ دونوں ہوتاؤں کو دانتوں میں دبایا۔ ایک جھنکلے سے بانو کا دوپٹہ نوچا اور اسے فرش پر زور سے پٹختنے کی کوشش میں پر لی طرف تپائی پر جا گرا۔

دوپہر کھینچنے سے بانو کے لبے بال اس کے چہرے پر پھیل گئے تھے۔ وہ چیخ کر پڑی۔ ایک ہاتھ سے بال ہٹا کر اس نے امین کو دیکھا اور چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپا کر وہ یوں سست کر بیٹھ گئی جیسے دوپہر اترنے سے اس کا سارا جسم نیکا ہو گیا ہے۔

چہرے پر سے بالوں کو بٹھنے کے مختصر سے وققے میں مہماںوں پر نشے کی ایک اور لہر گز رگنی اور وہ داد دینے لگے: ”واہ! واہ! گڈلارڈ! اے ما سرچیں! مس انگرڈ بر گیمن آف لا ہور! اونڈر فل! ایکسکوئرٹ! بیوٹی انکار نیٹ! مسر ہملٹن آف ٹوئنچنچ سپری!“

”تھینک یو تھینک یو ویری چی!“ امین نے داد وصول کی اور چار بیگمات نے اسے سہارا دے کر کھڑا کر دیا۔

بانو کا گھری بنا ہوا جسم یوں مل رہا تھا جیسے بار بار کوئی اس کی پسلیوں میں کچو کے کے دے رہا ہے۔

”رومٹ بانیا!“ امین اس کو پاس گھٹنوں کے بل گرا کر پکارا۔ ”ایکسکیو زمی ڈارلنگ! میں شادی کے بعد سے تم پر زبردستی کر رہوں۔ میں اس زبردستی کی معافی مانگتا ہوں۔ گنگا رہوں میں مجرم ہوں میں حرام زادہ ہوں۔ مجھے معاف کرو بانیا! آج سے تمہار پر دہ ختم۔ باقی کا ذ آج سے ابھی سے ختم۔ میرا خدا میرا گواہ ہے میرے افسر میرے گواہ ہیں میرے افسروں کی بیگمیں میری گواہ ہیں۔ آپ سب لوگ گواہ ہیں نا؟“

عورتوں مردوں نے اثبات کا نعرہ مارا۔

”لواب تو خوش ہو جاؤ بانیا ڈارلنگ۔“ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ امین کی آواز بھر اگئی۔ اس کے چہرے پر تشنیخ کی کیفیت چھا گئی۔ وہ رونے بھی لگا اور ہنسنے بھی لگا اور کہنے لگا: ”اسی خوشی میں میں نے شراب پی ہے، تم بھی شراب پیو، میرے کوئی پلاو۔ ساری دنیا کو پلاو۔ میرے افسروں سے ہاتھ ملاو،“ میرے افسروں کو لٹھی دکھاؤ۔ میرے افسروں کو خوش کرو بانیا ڈارلنگ! اوہ بانیا ڈارلنگ!“ اور امین سمی ہوئی بانو کے قدموں پر سر کھکھ بچوں کی طرح رو نے اور ہنسنے لگا۔

